کیچڑ میں کنول
نگہت سیما

ناولٹ

ایک کیچڑ میں کنول

نگہت سیما

رات بہت اندھیری تھی، گہری سیاہ گھور اندھیری رات...... اماوس کی راتوں کا زرد کمزور چاند بھی ڈوب گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ دھرے ادھ کھلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی...... سامنے گلی میں کھمبے پر جلنے والا پیلا زرد، بیمار روشنی والا بلب بھی آج نہیں جل رہا تھا۔ شاید فیوز ڈ تھا۔ ہاں چوباروں

کی کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے روشنیاں چھن، چھن کر باہر آرہی تھیں...... کبھی کبھی طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی آوازیں ہوا کے دوش پر لہراتی لمحے بھر کے لیے آتیں اور پھر گم ہوجاتیں...... نیچے گلی میں کبھی کبھی قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی اور کبھی کسی کی لڑکھڑاتی آواز میں گانے کے بول کانوں میں پڑتے تھے۔

یہ کھڑکی پچھلی گلی میں کھلتی تھی...... سامنے والی گلی میں شاید اب بھی رونق ہوگی، پھولوں اور مٹھائیوں کی دکانیں کھلی ہوں گی لیکن اس گلی میں اندھیرا تھا سامنے والے چوباروں کی پچھلی کھڑکیاں اور پچھلے دروازے تھے اُدھر گلی میں سے کوئی منچلا گاتے ہوئے گزرا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِنو بہار چلے...... اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کمرے میں مدھم روشنی کا پیلا بلب جل رہا تھا۔ کمرا نہ بڑا تھا نہ چھوٹا...... دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ دو بیڈ بچھے ہوئے تھے ساتھ میں سائڈ ٹیبلز تھیں۔ درمیان والی خالی جگہ پر چنیوٹی طرز کا بھاری سنگار میز تھا۔ جس پر درمیانے درجے کا میک اپ کا سامان پڑا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ قالین بچھا تھا...... اور اس کے چاروں طرف جگہ خالی تھی۔ سرخ، مسٹرڈ، سفید، میرون اور سبز رنگ کا یہ قالین ہاتھ کا بنا ہوا تھا...... اور مشتری بیگم کی والدہ کو کسی نے تحفے میں دیا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ملنے والا یہ تحفہ اب خاصا بوسیدہ ہوچکا تھا لیکن مشتری بیگم کا اسے پھینکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بقول ان کے "آج کل تو ہاتھ کے بنے قالین لاکھوں میں ملتے ہیں۔" پتا نہیں یہ قالین قیمتی تھا یا اس کے دینے والے سے مشتری بیگم کی بھی کوئی خاص یادیں وابستہ تھیں کہ مشتری بیگم نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کمرا کچھ عرصے پہلے تک مشتری بیگم کے استعمال میں ہی تھا...... لیکن اب جوڑوں کے درد کی وجہ سے ان کا سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ نیچے کے حصے میں رہتی تھیں اور یہ کمرا انہوں نے شہزادی اور رانی کو دے دیا تھا۔ یہ چوبارہ کوئی اتنا بڑا نہیں تھا نیچے ایک بڑا ہال اور تین چھوٹے کمرے تھے، ہال میں محفل سجائی جاتی تھی اور ہال کی چھت پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے...... اور وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ ہال کی سجاوٹ اچھی طرح سے کی گئی تھی اور یہیں کے تین چھوٹے کمروں میں سے ایک میں مشتری رہتی تھی جبکہ باقی دو کمروں میں سے ایک میں لڑکیاں رہتی تھیں یعنی صبو، پنو اور راگنی...... جبکہ ڈیوڑھی میں بنے کمروں میں استاد اور سازندے رہتے تھے۔ یہ کمرے اندھیرے اور سیلن زدہ تھے...... ڈیوڑھی کا دروازہ ایک چھوٹے سے چوکور صحن میں کھلتا تھا۔ صحن کا فرش شطرنج کی بساط کی طرح تھا۔ سفید اور سیاہ ڈبوں والا...... ڈیوڑھی میں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھیں...... یہ سیڑھیاں سیدھی اور تنگ تھیں...... اوپر تین کمرے اور ایک باورچی خانہ تھا...... دو کمرے مہمانوں کے لیے مخصوص تھے جن میں جدید انداز کا فرنیچر تھا جبکہ تیسرا مشتری بیگم کا سابقہ کمرا...... جو اَب رانی اور شہزادی کے زیرِ استعمال تھا۔ سامنے والے کمروں کے آگے گلی کی طرف بالکونیاں تھیں...... بالکونیوں کے جنگلے کبھی سبز رہے ہوں گے لیکن اب روغن جگہ، جگہ سے اکھڑ چکا تھا...... باورچی خانہ بھی اوپر والے حصے میں تھا...... جو کافی کشادہ تھا اور باورچی خانے کا کام چاندنی اور اس کے بیٹے خانو کے سپرد تھا...... سردیوں میں دونوں باورچی خانے میں ہی چارپائیاں بچھا لیتے اور گرمیوں میں چھت پر......

گانے والا منچلا ابھی گلی میں ہی چکر لگا رہا تھا۔ کبھی اس کی آواز بلند ہوجاتی کبھی آہستہ...... سامنے والے چوبارے کی کھڑکیوں سے آنے والی روشنی اب نہیں آرہی تھی۔ تب ہی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا...... رانی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو سوئی نہیں شہزادی......؟" وہ کھڑکی کے

پاس کھڑی شہزادی کو دیکھ کر بولی۔

شہزادی نے مڑ کر دیکھا...... رانی مسہری پر بیٹھ گئی تھی اور اب جھک کر گھنگرو کھول رہی تھی۔ اس نے لمبی سی میرون فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ فراک کی چولی پر دبکے اور موتیوں کا کام تھا۔

"نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ کھڑکی بند کرکے اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

"تو پھر نیچے ہی آجاتیں...... بڑے دنوں بعد آج خوب رونق تھی۔"

شہزادی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"تجھے تو بخار تھا شہزادی، گولی کھا کر لیٹ جاتی۔" رانی نے سیدھے ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور زیور اتارنے لگی۔

"اماں ناراض ہورہی تھیں مجھ سے؟"

شہزادی نے پوچھا۔

"نہیں فکر کررہی تھیں تیری کہ اتنے دن سے بخار اتر کیوں نہیں رہا...... کہہ رہی تھیں صبح خانو اور چاندنی کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلی جانا......" رانی نے زیور سمیٹ کر دراز میں ڈالا...... اور کھڑے ہوکر سنگار میز کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پھر ایک انگڑائی لے کر شہزادی کی طرف دیکھا۔ "وہ...... وہ نہیں ہے، وہی لمبا سا لڑکا...... اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ آتا ہے کبھی کبھی۔ بڑے کھلے دل کا ہے...... اس نے آج اماں سے کہا کہ وہ مری جارہا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ چلوں لیکن اماں نے کہہ دیا کہ ہم گانے والیاں ہیں ساتھ لے کر جانا ہے کسی کو تو پار والی گلی میں چلے جاؤ...... حالانکہ میرا دل تو......"

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور مسکرائی۔

شہزادی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ رانی کو پیلی روشنی میں اس کا رنگ بے حد پھیکا اور پیلا سا لگا۔

"تیری طبیعت زیادہ خراب ہے شہزادی......؟"

رانی نے دیوار میں نصب لکڑی کی الماری کھول کر کپڑے نکالے۔

"ہاں...... نہیں تو بس ٹھیک ہی ہے۔"

"پھر بھی صبح ڈاکٹر کے پاس ضرور چلی جانا۔"

اس نے سر ہلایا۔

رانی نے لائٹ آف کردی اب کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ بس کپڑوں کی سرسراہٹ تھی۔ شہزادی یوں ہی پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی، کچھ دیر بعد رانی نے کپڑے بدل کر بتی جلائی...... اب وہ شلوار قمیص میں تھی کالے پھولوں والی پیلی قمیص اور کالی شلوار...... اتارے ہوئے کپڑے تہ کرکے اس نے الماری میں رکھے اور پھر لیٹنے سے پہلے شہزادی کی طرف دیکھا۔

"بتی بجھا دوں......؟ تو بھی سوجا......"

"نہیں، مجھے نیند نہیں آرہی رانی تو سوجا۔"

"ارے نیند کیوں نہیں آرہی، دل تو نہیں دے بیٹھی کسی کو؟" رانی نے تکیہ سر کے نیچے ٹھیک کرکے رکھا اور شہزادی کی طرف رخ کرکے لیٹ گئی۔

"پتا ہے اس روز اماں صبو سے کہہ رہی تھیں۔

"سب کچھ دے دینا اس امیرزادے کو پر دل نہ دینا بڑی خوار ہوگی۔"

"نہیں، میرا دل تو میرے پاس ہی ہے رانی...... ہم جیسوں کے دل بھی تو ہمارے جیسے ہوتے ہیں، بے وقعت، بے معنی...... گلیوں میں پڑے روڑے، کوڑے کی طرح ہمارے دل کی کیا قیمت...... بے مول بھی کوئی نہ لے۔"

"واہ، کیوں نہیں ہے قیمت بھلا......؟" رانی جیسے چیخی تھی۔ "ارے بھلا بے مول کیوں دیں ہم...... لگانے والے ان کی بھی بڑی قیمت لگاتے ہیں۔"

"پر میں نے تو نہیں دیکھا اٹھارہ برسوں میں کسی ایسے کو اس چوبارے پر آتے جو صرف دل کا خریدار ہو۔" اس کے لہجے میں پتا نہیں ایسا کیا تھا کہ

رانی نے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"کیوں...... کیا تو دل کا سودا کرنا چاہتی ہے؟"

"پتا نہیں......" وہ اپنی انگلیوں کو چٹخا رہی تھی۔

"ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، صرف اٹھارہ سال......" رانی ہنسی تھی۔ "ابھی سیکڑوں آئیں گے اپنا دل تیرے قدموں میں رکھنے......"

"لیکن مجھے سیکڑوں کی تو نہیں بس ایک کی چاہ ہے۔" شہزادی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ہائے کیا تیرا من ابھی سے کسی کا طلبگار ہو گیا ہے۔ ابھی تو...... تو محفل میں بھی نہیں آئی...... سچ بتا کون ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں رانی...... میں نے یونہی ایک بات کہی تھی...... میں تو کچھ اور سوچتی ہوں۔"

"کیا بھلا......؟" رانی نے ادھ میچی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"مجھے کسی دل والے کی تلاش نہیں ہے رانی نہ مجھے اپنے دل کا سودا کرنا ہے۔"

"پھر کیا سوچتی رہتی ہے ہر وقت...... جب سے کالج جانا چھوڑا ہے، ہر وقت گم صم رہتی ہو۔"

"میں تو یہ سوچتی ہوں کہ کیا اماں سچ مچ ہماری اماں ہیں اور ہم دونوں سگی بہنیں ہیں اور ہمارا باپ......؟"

"باپ تو جو بھی تھا مر کھپ گیا ہوگا...... چاندنی نے ہی بتایا تھا مجھے اماں نے راموا استاد سے نکاح پڑھوایا تھا...... بہت شوق تھا اسے گھر بنا کر رہنے کا...... اب پتا نہیں اس نے نکاح پڑھوایا بھی تھا یا نہیں...... لیکن چاندنی کہتی ہے تیری ماں کو شوق تھا اور راموا، میں جب دو سال کی تھی چلا گیا مڑ کر آیا ہی نہیں...... اور رہی اماں کی بات تو وہ تو سو فی صد ہماری ماں ہیں...... سگی ماں......" شہزادی کی آنکھیں بجھ گئیں اور چہرہ پھیکا، پھیکا لگنے لگا۔

"کاش اماں ہماری سگی اماں نہ ہوتیں، میں یہ سوچ، سوچ کر خوش ہوتی رہتی کہ میں نے یہاں شاہی محلے کے اس چوبارے میں جنم نہیں لیا...... کسی اعلیٰ خاندان کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور کوئی اغوا کر کے مجھے اماں کے پاس چھوڑ گیا تھا اور میری رگوں میں دوڑنے والا خون...... ہا...... یہ سوچنا بھی کتنا خوش کن اور دلفریب ہے ناں......"

"اسی لیے اماں کہتی ہیں رسالے نہ پڑھا کر دماغ خراب کرتے ہیں...... اب یہ تو کہانیوں اور فلموں میں ہوتا ہے ناں کہ کوٹھے پر پلنے والی کسی نواب یا امیر زادے کی بیٹی ہو اور وہ اسے ڈھونڈتا ہوا آئے اور اپنی دنیا میں واپس لے جائے...... لیکن ہم تم اگر کسی نواب کی اولاد بھی ہوں تو کوئی ہمیں ڈھونڈتا ہوا نہیں آئے گا، شہزادی کہانیوں اور حقیقتوں میں بہت فرق ہوتا ہے چندا......"

"لیکن کبھی کبھی حقیقت میں بھی تو ایسا ہوتا ہے کہ شریف ماں، باپ کی بیٹی چوبارے پر پہنچ جاتی ہے جیسے صبو، راگنی اور پنو...... یہ تینوں تو اماں کی بیٹیاں نہیں ہیں ناں......"

"صبو تو گھر سے بھاگی تھی اور اس کا عاشق اماں کے پاس اسے بیچ گیا...... راگنی تو اسی گلی کی ہے اور پنو کا مجھے پتا نہیں۔" رانی نے جمائی لی۔

"کاش میں بھی اماں کی بیٹی نہیں ہوتی، بھلے میرا عاشق ہی مجھے بیچ گیا ہوتا......" اس کی آنکھوں سے کوئی حسرت جھانکنے لگی تھی۔

"تو اماں کی بیٹی ہی ہے شہزادی، تجھے یقین کیوں نہیں آتا...... ہزار دفعہ تو چاندنی سارا قصہ سنا چکی ہے، پیدا ہونے سے لے کر اب تک کہ اس نے ہمارے لنگوٹ دھوئے، ہمیں پالا...... اور تو جب پیدا ہوئی تھی تو کالی سیاہ چوہیا جیسی تھی...... اور پھر جب تو نے دانت نکالے تو کتنا تنگ کیا تھا تو نے...... اور پھر جب سیڑھیوں سے گر کر دانت تڑوا بیٹھی تھی تو...... پھر بھی یقین نہیں آتا تو دوبارہ پوچھ لو...... چاندنی کو تو بس چابی

دینے کی ضرورت ہے...... شروع ہو جائے گی......"

"اُف...... او...... رانی پتا ہے مجھے سب جانتی ہوں کہ میں اماں کی ہی بیٹی ہوں...... لیکن میں خواب دیکھنا چاہتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر تم کیوں مجھے نہیں دیکھنے دیتیں۔"

"ٹھیک ہے بابا دیکھو خواب اور اب مجھے سونے دو، تین بجنے والے ہیں۔"

رانی نے چادر سر تک اوڑھ لی اور کروٹ بدل لی، شہزادی کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر بتی بجھا دی لیکن بستر پر جانے کے بجائے وہ پھر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی تھی۔ باہر اندھیرا تھا...... کھڑکیوں سے آنے والی مدھم روشنی بھی نہیں تھی...... کھڑکی کے عین نیچے سے کسی بلی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ پتا نہیں یہ بلیاں کیوں روتی ہیں۔ مشتری بہت چڑتی تھی، نری نحوست...... کسی چوبارے کی کھڑکی کھلی تھی اور کسی نے کشش کرتے ہوئے کوئی پتھر پھینکا تھا...... اور بلی کے رونے کی آواز اب بند ہو گئی تھی لیکن وہ یونہی کھڑکی میں کھڑی رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی۔ کمرے میں رانی کے ہلکے، ہلکے خراٹے گونجنے لگے تھے۔

"اور رانی کتنی مطمئن ہے اور اپنی اس زندگی سے...... پتا نہیں میں کیوں مطمئن نہیں ہوتی...... شاید اس لیے کہ رانی نے زندگی کو صرف اس چوبارے کے اندر ہی دیکھا ہے اور میں نے اس کے علاوہ بھی ایک اور زندگی دیکھی ہے۔ ایک بالکل مختلف زندگی...... مولوی صاحب کے گھر کی زندگی...... وہاں مولوی صاحب کے گھر کی زندگی میں بلا کی کشش محسوس ہوتی تھی۔" وہ کھڑکی سے لگی باہر اندھیری گلی میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی...... وہ سب کچھ جو اس نے سنا تھا اور اسے بتایا گیا تھا اور وہ سب کچھ جو اس کے خود اپنے ساتھ بیتا تھا۔

تقسیم سے پہلے مشتری بیگم کی ماں جہاں آرا راول پنڈی میں "بلیوں کی سراں......" میں رہتی تھیں اور میجر پارسن اکثر اس کے پاس آتا تھا یا چھاؤنی بلا لیتا تھا۔ کہتے تھے کہ میجر پارسن کا دل آ گیا تھا اس پر اور جب وہ راول پنڈی سے لاہور آیا تو اسے بھی ساتھ ہی لے آیا تھا...... یہ وہ دن تھے جب ملک کی تقسیم کا شور تھا...... جہاں آرا کچھ عرصہ میجر پارسن کے ساتھ اس کے ماڈل ٹاؤن والے بنگلے میں رہی تھی اور پھر جب ملک کی تقسیم کے بعد میجر پارسن کو ملک چھوڑنا پڑا تو وہ ایک چھوٹی گود کی بچی کے ساتھ اس چوبارے میں آ گئی تھی۔ وہ بچی یعنی مشتری بیگم اسی میجر پارسن کی اولاد تھی۔ نیلی کچور آنکھیں، چٹا گورا رنگ بالکل انگریزوں جیسا......

اکثر چاندنی جب فارغ ہوتی تو بتایا کرتی تھی اس چوبارے میں پہلے گومتی رہتی تھی اور میجر پارسن کی جہاں آرا سے بھی پہلے اس سے بہت راہ رسم تھی...... راول پنڈی جانے سے پہلے وہ اکثر گومتی کو اپنے بنگلے میں لے جاتا تھا اور گومتی مہینوں وہاں رہتی تھی...... اور تقسیم کے بعد میجر پارسن نے ہی اسے بحفاظت سرحد پار بھجوانے کا انتظام کروایا تھا اور جانے سے پہلے میجر پارسن کے کہنے پر بھی وہ اپنا چوبارہ جہاں آرا کو دے گئی تھی...... سجا سجایا سامان سے بھرا...... چاندنی تو یہ بھی کہتی تھی کہ یہ قالین دراصل میجر پارسن نے ہی جہاں آرا کو گفٹ کیا تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تھا تو چاندنی ہی کوئی چار پانچ سال کی تھی۔ جب جہاں آرا چوبارے میں آئی تو سازندوں اور استاد رنگو کے علاوہ یہ بچی بھی وہاں موجود تھی۔ یوں چاندنی بھی جہاں آرا کو تحفے میں ملی تھی...... نام تو اس کا چاندنی تھا لیکن وہ خود سیاہ اندھیری رات تھی۔ سیاہ رنگ، چھوٹا سا قد، چپٹی ناک لیکن اب 65 سال کی عمر میں بھی بڑی پھرتیلی تھی...... باورچی خانے کا کام اس نے کب سنبھالا تھا یہ تو مشتری بیگم کو بھی یاد نہیں تھا لیکن جب سے مشتری

نے ہوش سنبھالا تھا اسے باورچی خانے میں ہی دیکھا تھا۔ عمر میں مشتری سے چار پانچ سال ہی بڑی تھی۔ ڈیوڑھی پر بیٹھنے والا تاجا سازندے، استاد رنگو سب گومتی کے بعد جہاں آرا کی ذمے داری بن گئے تھے، افراتفری کا زمانہ تھا۔ بہت عرصے تک چوبارہ بے آباد ہی رہا...... اِدھر اُدھر بھی چوبارے خالی ہی دِکھتے تھے پہلے تاجا گیا پھر کچھ سازندے دوسرے چوبارے پر چلے گئے لیکن چاندنی یہاں ہی رہی...... پھر ہولے، ہولے لوگ تقسیم کے دکھ بھولنے لگے...... زخموں پر کھرنڈ جم گئی تو چوبارے پھر سے آباد ہوگئے...... لٹی پِٹی بے سہارا لڑکیاں بھی مطلبی، خودغرض اور لالچی لوگوں کے طفیل پہنچائی جانے لگیں تو جہاں آرا کا چوبارہ بھی آباد ہوگیا...... مشتری، جہاں آرا کی واحد اولاد تھی، جہاں آرا نے اس کی تربیت شروع کردی تھی...... لیکن چوبارے میں دو تین لڑکیاں...... مظلوم سہارے کی آس میں دھوکا کھا کر یہاں پہنچ گئی تھیں...... چاندنی کہتی تھی کہ اس نے تاجے سے شادی کرلی تھی...... بقول مشتری، تاجا بھی چاندنی کے جوڑ کا ہی تھا۔ کالا بھجنگ ایک آنکھ سے کانا اور خانو اسی پر گیا تھا...... پر چاندنی کی جان اٹکی رہتی تھی اس میں، چالیس سال کا ہوگیا تھا لیکن چاندنی کا بس نہیں چلتا تھا کہ نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں دے لیکن اگر وہ تاجے کا بیٹا تھا جب تاجا یہاں سے گیا تھا تو چاندنی ہی کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی اور خانو کی عمر ہونی چاہیے ستاون، اٹھاون سال کہ پاکستان بنے ساٹھ سال ہوچکے تھے لیکن خانو تھا ہی انتالیس، چالیس کا اور بقول چاندنی کے پاکستان بنے تین سال ہوئے تھے جب تاجا اور دوسرے لوگوں نے چوبارہ چھوڑا تھا تو چاندنی سات آٹھ سال کی تھی تو...... یہاں آکر شہزادی کا سارا حساب گڑبڑ ہوجاتا تھا لیکن پھر بھی اس نے چاندنی کی بات کو مان لیا تھا کہ خانو اس کا بیٹا ہے اور تاجا، خانو کا باپ...... خانو

باہر کے سارے کام کرتا تھا...... جہاں آرا کے بعد بھی چوبارہ آباد رہا کہ مشتری خوب صورت بھی تھی اور گلے میں سُر بھی تھا...... لیکن پتا نہیں کہاں سے اس کے دل میں گھر، گرہستی کا شوق چرایا تھا۔

"چاندنی میں شادی کرنا چاہتی ہوں......" لیکن حسن کے قصیدے پڑھنے والے تو بہت تھے لیکن شادی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ تب پینتیس سال کی عمر میں مشتری نے موسیقی سکھانے والے استاد رامو سے ہی شادی کرلی...... رامو پچاس، پچپن کا تھا لیکن پھر جب رانی دو سال کی ہوئی تو رامو ایک روز میو اسپتال میں پٹی کروانے گیا اور پھر مڑ کر نہیں آیا...... حالانکہ مشتری نے تو چاندنی کے ساتھ جاکر مردہ خانے میں بھی دیکھ لیا تھا تو اب رانی تھی پچیس سال کی اور شہزادی تھی پورے اٹھارہ سال کی اور یہاں آکر شہزادی کا حساب پھر گڑبڑ ہوجاتا اور وہ خواب دیکھنے لگتی تھی کہ وہ کسی بڑے آدمی کی اکلوتی بیٹی تھی جسے اغوا کرکے کوئی غنڈہ مشتری کے چوبارے میں چھوڑ گیا تھا لیکن اس کے خوابوں کو رانی یوں تار تار کردیتی جیسے روشنی رات بھر دیکھے گئے خوابوں کو آنکھوں سے نوچ لیتی ہے...... چاندنی بھی روشنی کی طرح ظالم تھی اس کے خوابوں کو بے دردی سے نوچتے ہوئے ذرا نہ ہچکچاتی، شہزادی کو وہ اپنے سامنے کے ایک ٹوٹے ہوئے دانت کے ساتھ ہنستی ہوئی بالکل چڑیل لگتی تھی حالانکہ اسے چاندنی سے بھی بہت محبت تھی۔

☆☆☆

"وہ بڑی کالی سیاہ رات تھی باہر بادل زور سے گرجتا تھا اور چوبارے کی کھڑکیوں سے جیسے بجلی لپک، لپک کر اندر آتی تھی اور مشتری درد اور تکلیف سے تڑپتی تھی...... میں بھاگ بھاگ کر ڈیوڑھی تک جاتی تھی...... اور باہر چھاجوں چھاج برستا مینہ اور اس پر ٹھک، ٹھک گرتے اولے...... کب کا گیا خانو سواری لے کر نہیں مڑا تھا اور سواری ملتی بھی

کیسے...... اسپتال میں نام درج کرا رکھا تھا...... گلی ویران نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات...... خانو بھی بوری لپیٹے ہانپتا کانپتا واپس آگیا...... نہ تانگا نہ ٹیکسی کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ بس پھر اللہ کا نام لے کر میں مشتری کے پاس بیٹھ گئی...... اور تو، تو میرے ہاتھوں میں پیدا ہوئی تھی اسی چوبارے کے اس کمرے میں جس میں اب نیا بیڈ بچھا ہے، صبح جب مشتری نے دیکھا تو حق دق...رہ گئی سوکھی سڑی کالی سرخ سی چوہیا جیسی لگ رہی تھیں تم۔"

اور شہزادی کے خوابوں کا شیش محل دھڑام سے گر کر چکنا چور ہوجاتا...... اس کے نصیب میں تو اسپتال میں پیدا ہونا بھی نہیں لکھا تھا۔ یہیں پیدا ہوئی یہیں مرجائے گی...... اور وہ کتنی ہی دیر تک ان خیالی کرچیوں کو انگلیوں کی پوروں سے چن، چن کر ہاتھ زخمی کرتی رہتی تھی اور یہ تب کی بات تھی جب اس نے مولوی صاحب کے گھر جانا شروع کیا تھا اور اب تو وہ چاندنی سے پوچھتی ہی نہیں تھی کچھ اور بارہ سال پہلے کی سنی بات کو وہ خود ہی خود جھٹلاتی رہتی تھی۔" چاندنی کو تو شوق ہے خواہ مخواہ اپنے کارنامے بتانے کا......"

بارہ سال پہلے جب وہ چھ سال کی تھی تو مشتری کو اچانک عاقبت سنوارنے کا خیال آیا تھا اس روز وہ باہر سے آئی تھی جب چاندنی نے اسے بتایا تھا۔

"ساتھ والی گلی کی گلشن بائی مرگئی اور مرتے دم سرہانے یٰسین شریف پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہائے مشتری پورے چوبارے کی لڑکیوں میں ایک کو بھی یٰسین شریف نہ آتی تھی۔ ڈیوڑھی کا لڑکا مولوی صاحب کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اِدھر گلشن کی سانس اٹکی ہوئی تھی...... ہائے مشتری میں تو دہل گئی تھی۔ وہاں کھڑی کونے میں گلشن کو دیکھتی تھی...... ہائے مشتری تو نے کیوں نہ قرآن پاک پڑھا......"

اور تبھی مشتری کی نظر شہزادی پر ٹھہر گئی تھی۔ جھٹ کالا فیشنی برقع پہن کر شہزادی کا ہاتھ پکڑ، مولوی صاحب کے ہاں پہنچ گئی...... یہ مولوی صاحب کبھی کبھار شاہی محلے میں آتے تھے جب کبھی چوبارے والیاں نیاز دلواتیں یا کسی کا چوتھا، دسواں، چالیسواں ہوتا تو انہی مولوی صاحب کو بلوایا جاتا تھا کہ دعا کروادیں۔ بھلے مانس آدمی تھے۔ چپ چاپ بغیر کسی حیل وحجت کے چلے آتے تھے۔ کوئی گلی میں داخل ہوتے دیکھ کر مذاق بھی اُڑا دیتا تو پروا نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا گھر شاہی مسجد کے عقب میں تھا۔ خود مولوی صاحب شاہدرہ کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد میں پیش امام تھے، گھر میں ان کی بیوی، بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں...... غریب اور متوسط گھرانے کی بچیاں پڑھنے آتی تھیں۔ چھوٹا سا گھر تھا دو کمرے اور ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے ساتھ باورچی خانہ پھر صحن، صحن میں غسل خانہ، لڑکیاں برآمدے میں ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے بیٹھی تھیں اور سامنے رحل پر رکھے سیپاروں کو ہل، ہل کر پڑھتی تھیں۔ شہزادی کو یہ سب بڑا اچھا لگتا تھا اور انوکھا بھی۔ استانی جی پیڑھی پر بیٹھ جاتی تھیں اور ایک ایک لڑکی کو پاس بلاکر سبق دیتی اور سنتی تھیں۔ وہ صبح فجر کے بعد اور دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد پڑھاتی تھیں...... لیکن کچھ اسکول پڑھنے والی لڑکیاں صبح نہیں آتی تھیں صرف ظہر کے بعد آتی تھیں۔ ہاں چھٹی والے دن دونوں ٹائم آتی تھیں۔ پر مشتری نے استانی جی کو بتادیا تھا کہ شہزادی صرف دوپہر میں آئے گی...... کبھی خانو اور کبھی چاندنی اسے چھوڑ جاتے تھے...... اور لے بھی جاتے تھے...... کبھی کبھار اگر پڑھنے کے بعد دیر ہوجاتی تو وہ زیب النسا کے ساتھ کھیلنے لگتی تھی۔ زیب النسا مولوی صاحب کی بیٹی تھی اور تقریباً اس کی ہم عمر ہی تھی...... وہ دونوں باورچی خانے کے اوپر بنی دوچھتی میں جاکر کھیلتیں...... اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹین کا بکسا تھا جس میں اس نے اپنے کھلونے اور گڑیاں وغیرہ

رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس دو تین گڑیاں تھیں...... کپڑے کی بنی ہوئی اور ایک پلاسٹک کی گڑیا بھی تھی لیکن اس کے پاس پلاسٹک، مٹی اور ٹین کے بے شمار کھلونے تھے...... گرہستی کا سارا سامان ...... چولھے، ہانڈی سے لے کر جگ، گلاس وغیرہ وہ جھوٹ موٹ کا کھانا پکاتیں، پیالیوں میں پانی کی چائے اور پلیٹوں اور ڈونگوں میں کچے چاول اور بھنے دانے رکھ کر کھانا کھاتیں۔ کبھی کبھی زیب النسا گڑیا کی شادی بھی رچاتی...... کبھی گڈی اسے دے دیتی اور گڈا خود رکھ کر بیاہ رچاتی کبھی گڈا اسے دیتی اور گڑیا خود رکھ لیتی...... ہمیشہ نکاح کے لیے عبدالرحمٰن کو بلایا جاتا جو زیب النسا کا بھائی تھا اور اس سے چار سال بڑا تھا۔ مولوی صاحب کے بس یہی دو بچے تھے۔ کبھی کبھار زیب النسا کی دو تین اور سہیلیاں بھی ہوتیں...... اور کئی بار جب خانو اسے لینے آجاتا تو اس کی گڑیا کی رخصتی اور نکاح ادھورا ہی رہ جاتا جس پر اسے بہت افسوس ہوتا اور یہ وہ زندگی تھی جو اس کے گھر کی زندگی سے بالکل مختلف تھی انوکھی اور پُرکشش ...... اور استانی جی بھی اسے مشتری اور چاندنی سے مختلف لگتی تھیں۔ جب وہ دوپٹے کی بُکل مار کر نماز پڑھتیں تو وہ انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ اور ایک بار اس نے مشتری سے کہا تھا کہ وہ بھی استانی جی کی طرح نماز پڑھا کرے تو مشتری نے اسے بتادیا تھا کہ اسے نماز پڑھنی نہیں آتی لیکن وہ ہے پکی مسلمان۔ تب اس نے مشتری سے کہا تھا کہ وہ استانی جی سے نماز پڑھنا سیکھ کر اسے بھی سکھادے گی۔ وہ استانی جی کی ہر حرکت کو غور سے دیکھتی اور مشتری کے ساتھ موازنہ کرتی رہتی تھی۔ استانی جی پڑھاتے، پڑھاتے اٹھ کر کام بھی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی باورچی خانے جا کر ہانڈی چڑھا آتیں کبھی دھلے کپڑے تہ کرنے لگتیں کبھی لڑکیوں کو سبق دے کر فارغ ہوتیں تو کروشیہ اٹھا کر کسی دوپٹے کی لیس (بیل) بنا رہی ہوتیں، کبھی کڑھائی کر رہی ہوتیں...... مولوی صاحب گھر آتے تو سر جھکائے کمرے میں چلے جاتے وہ فوراً اٹھ کر جاتیں کبھی چائے بنا کر لے جاتیں اور کبھی پانی گلاس میں ڈال کر ان کی خدمت میں لے جاتیں۔ زیب النسا .... جب انہیں ابا کہہ کر بلاتی تو اسے اچھا لگتا تھا وہ دل ہی دل میں خود بھی ابا کہہ کر اس کی حلاوت کو محسوس کرتی۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس نے اماں سے پوچھا تھا کہ اس کے ابا کہاں ہیں تو مشتری نے بتایا تھا کہ مر گیا تیرا ابا...... اور اس روز وہ چپکے، چپکے بہت روئی تھی۔ اسے زیب النسا جسے کھلونے لینے کا بھی شوق تھا۔ ''ایسے ہی کھلونوں اور گڑیوں سے کھیل کر لڑکیاں گرہستی سیکھتی ہیں۔ پر تجھے کون سا گرہستی چلانی ہے۔'' چاندنی نے اسے پلاسٹک کا کھلونا ڈنر سیٹ لے کر دیتے ہوئے کہا تھا...... تب تو وہ چاندنی کی بات نہ سمجھ سکی تھی لیکن اب اچھی طرح سمجھتی تھی۔

وہ مولوی صاحب کے گھر قرآن پاک پڑھنے جاتی تھی۔ مشتری نے چاندنی کے کہنے پر بھی اسے گانا سیکھنے کے لیے نہیں بٹھایا...... پتا نہیں کیوں...... ٹال دیا چاندنی کو۔

''پہلے کلام پاک تو پڑھ لے، نہ اُدھر کی رہے گی نہ اِدھر کی...... اور تیرے مرتے سمے مولوی صاحب نہ ملے تو پھر سرہانے یٰسین شریف کون پڑھے گا۔''

مشتری ہنسی تھی اور چاندی نے سر ہلا دیا تھا لیکن سُر تو اس کے گلے میں بولتے تھے۔ مولوی صاحب کے گھر میلاد ہوا تو اس نے بھی زیب النسا کے ساتھ مل کر نعت پڑھی اور جب گھر میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے نعت کے بول دُہرانے لگی تو استاد جی چونکے...... کئی بار بلا کر نعت سنی اور مشتری سے کہا۔

''تیری بیٹی کے گلے میں سُر بولتے ہیں۔'' اور جس روز اس نے زیب النسا سے سیکھی ہوئی دعا طرز لگا کر مشتری کو سنائی تو مشتری تو جھوم، جھوم اٹھی۔ کیا سوز تھا...... کیا آواز تھی...... معصوم آواز میں اتنا سحر،

نہ سکھایا نہ بتایا اور نہ کہیں سانس ٹوٹی اور نہ کہیں سُر اونچے نیچے ہوئے۔ وہ لہک لہک کر گاتی رہی۔

''آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلوں ہٹ جاؤ دے جاؤ راہ جانے کے لیے
اے دعا ہاں عرض کر عرشِ الہٰی تھام کر
اے خدا اب پھیر دے رخ گردشِ ایام کے
خلق کے روندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں''

''کہاں سے سیکھا یہ؟'' مشتری نے اسے چوم کر کہا تھا۔

''زیب النسا نے سکھائی ہے اور اس نے استانی جی سے سیکھی ہے۔ استانی جی کہتی ہیں ان کے زمانے میں صبح صبح لڑکیاں اسمبلی میں پڑھتی تھیں کبھی لب پہ آتی ہے دعا اور کبھی یہ...... ایک لڑکی پہلے پڑھتی آگے کھڑے ہو کر اور باقی اس کے پیچھے بعد میں مل کر دُہراتی تھیں۔'' اور ساتھ ہی اس نے فرمائش بھی کرڈالی۔

''اماں مجھے بھی زیب النسا کے اسکول میں داخل کروادو ناں......''

''لو اور سنو......'' مشتری نے چاندنی کی طرف دیکھا تھا۔

''گلشن کے چوبارے کی تو بہت ساری لڑکیاں اسکول جاتی ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے مشتری...... اب یہ 1950ء تو ہے نہیں، ارے پڑھائی بھی تو سمجھو میک اپ کی طرح ہے، سرخی پاؤڈر منہ کو چمکاتا ہے تو پڑھائی پوری ذات کو چمکا دیتی ہے۔'' اور چاندنی جھٹ سے بولی تھی۔

یوں شہزادی اسکول بھی جانے لگی تھی لیکن ساتھ ہی مشتری کے کہنے پر موسیقی کے اسباق بھی استاد جی نے دینے شروع کردیے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ تھوڑی دیر بعد ہی پہلو بدلنے لگتی تھی۔ حالانکہ استاد جی اس پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ آواز خداداد تھی۔ موسیقی کے رموز واوقاف سکھاتے ہوئے انہوں نے سارے ہی راگوں میں اسے طاق کردیا تھا...... پہلا مکمل کلام جو اس نے سنایا تھا وہ اقبال کا کلام تھا۔ استاد جی بھی رمز شناس تھے۔ جانتے تھے کہ ایسی ہی چیزیں ڈوب کر پڑھتی ہے مشتری کے سامنے آج امتحان مقصود تھا۔

''نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر''

جوں ہی اس نے بول اٹھائے محفل میں سکوت چھا گیا۔ یہ کوئی معمول کی محفل نہیں تھی اس میں صرف مشتری، چاندنی، خانو اور سازندے تھے...... مشتری تو جیسے اس کی آواز کے سحر میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے سر پر دوپٹا اچھی طرح کیے دو زانو...... بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

''شہیدِ عشق نبی ﷺ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے
اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر''

اور جب پوری نعت پڑھنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں تو مشتری کی آنکھوں میں نمی تھی اور چاندنی تو باقاعدہ انگلیاں چومتے ہوئے آنکھوں سے مس کرتی تھی اور روئے جاتی تھی اور جب مشتری بولی تو اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''استاد جی ہماری شہزادی تو اپنی آواز سے ہی دلوں کو قدموں میں گرالے گی۔'' لیکن اسے دلوں کو قدموں میں گرانے کا شوق نہیں تھا اسے تو بس ایک دل کی تمنا تھی جو اس کے قدموں میں نہ گرے اس کے پہلو میں اس کے دل کے ساتھ دھڑکے...... اور جس روز اس نے یہ نعت پڑھی تھی وہ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی...... قرآن پاک اس نے ختم کرلیا تھا اور یٰسین شریف کے علاوہ کئی اور سورتیں بھی زبانی یاد کروائی تھیں استانی جی نے اور جب اس نے چاندنی کو سورۂ یٰسین زبانی خوب صورت قرأت

کے ساتھ سنائی تھی تو چاندنی کے دل میں ایسا اطمینان اترا تھا۔ موت کا خوف اور جان اٹکی رہ جانے کا ڈر یک دم ختم ہوگیا تھا اور اس روز اس نے مشتری کے گھٹنے تھام کر کہا تھا۔

”مشتری میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”کیسا احسان؟“ مشتری ہاتھوں اور بالوں کو موتیے کے گجروں سے سجا رہی تھی۔

”تو نے شہزادی بٹیا کو قرآن پاک پڑھوا دیا۔“

”تجھے یقین ہے چاندنی جب تیری آخری سانس تیرے حلق میں اٹکے گی تو شہزادی تیرے پاس ہوگی؟ کیا پتا پہلے ہی کہیں اُڑ اڑا جائے۔ یہ پرانا دور نہیں ہے کہ ساری عمر ایک ہی چوبارے میں گزار دیں...... لڑکی کو تیرے کہنے پر میں نے اسکول بھی داخل کروا دیا ہوسکتا ہے فلموں میں چلی جائے...... بھاگ جائے کسی کے ساتھ گھر بسا لے۔“ مشتری کبھی کبھی یوں ہی جی جلاتی تھی۔ ایک لمحے کو چاندنی کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔

”جو اللہ کی رضا مشتری......“ اس نے صحن میں بال سکھاتی شہزادی کو دیکھا تھا۔ دبلی پتلی سانولی سوکھی...... اسے بھلا کس نے فلم میں کام دینا ہے اور کس نے دل کی ملکہ بنانا ہے۔ لیکن یہی سوکھی سڑی شہزادی جب سولھویں برس میں پہنچی تو مشتری نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ کیا رنگ و روپ نکالا تھا اس نے سیاہ غزال آنکھیں، لمبے گھنے بال، خوب صورت قد بت، سانولا رنگ لیکن اتنی ملاحت اتنی دلکشی کہ وہ گوری چٹی رانی سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی تھی اور جس روز استاد جی نے اسے اوکے کیا تھا کہ اب محفل میں بٹھا دو۔ اسی روز اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔

”نہ استاد جی، ابھی پڑھ رہی ہے وہ، دو سال اور پڑھے گی آپ ریاض کرواتے رہیں۔“ اس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ کھڑے کھڑے بھی جیسے بل کھاتا نظر آتا تھا لیکن رقص کے لیے اس کے پاؤں اٹھتے ہی نہیں تھے۔ ٹکر ٹکر استاد کا منہ دیکھا کرتی۔

”رقص کو تو رہنے ہی دو مشتری بیگم...... اس کا مزاج نہیں ہے، اس کا گلا ہی تجھے بھوکا مرنے نہیں دے گا۔ سونے میں تُلے گی اپنے سُر اور گلے کی وجہ سے۔“

اور مشتری بھی چپ ہو رہی تھی۔

اور ان دو سالوں میں اس نے گانے میں کمال حاصل کرلیا تھا...... اور بارہ جماعتیں بھی پڑھ لی تھیں...... دس دن پہلے آخری پرچہ دیا تھا اور ان دس دنوں میں ایک بار مشتری نے اسے محفل میں گوایا۔ کالج، یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور باقاعدہ کسی بڑی محفل میں گانے سے پہلے مشتری چاہتی تھی کہ وہ پختہ ہوجائے لیکن وہ جو نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی تو آخری بول پر ہی نگاہ اٹھائی تھی۔ ناز نہ ادائیں...... مشتری نے رانی سے کہا کہ ذرا آدابِ محفل بھی سکھاؤ اور رانی ادب آداب کیا سکھاتی تب سے وہ بخار چڑھائے بیٹھی تھی اور سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ پتا نہیں وہ بیمار تھی یا اسے لگتا تھا وہ بیمار ہے۔ اس نے مشتری سے کہا تھا۔ وہ بی اے کرنا چاہتی ہے لیکن مشتری نے صاف منع کردیا۔

”نہ بھئی میرے جگرے میں اتنا دم نہیں ہے۔ چوبارہ اجڑا ویران۔ کبھی بھولے بسرے کوئی آجائے تو اور وہ بھی صرف گانا سننے کو نہیں مانگتے اور تقاضے کرتے ہیں اب ساری عمر گانے کے علاوہ اور کام نہیں کیا تو اب کیا ریت روایت بدل دیں۔ درجن بھر بندوں کا پیٹ بھریں یا تیرا پڑھائی کا خرچہ پورا کریں؟“ اور شہزادی جانتی تھی کہ مشتری غلط نہیں کہتی تھی۔

”ارے شہزادی یہاں آنے والے سب بھوکے ننگے ٹٹ پونجیے جیب سے پیسہ نکالتے جان نکلتی ہے۔ دو ٹکے جیب میں ڈال کر آجاتے ہیں گانا سننے...... ہونہہ۔“

شہزادی نے سوچا تھا وہ روزن بند ہوا جس سے ٹھنڈی میٹھی ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ وہ پڑھائی

میں کوئی ممتاز طالبہ نہیں تھی لیکن وہ پڑھنا چاہتی تھی جب وہ اپنی گلی سے نکل کر شاہی مسجد کے میناروں پر نظر ڈالتے ہوئے اسٹاپ پر کھڑی ہوتی تو اسے لگتا تھا یہ کوئی اور شہزادی ہے اور چوبارے میں رہنے والی مشتری بیگم کی بیٹی وہاں ہی پیچھے رہ گئی ہے۔

مولوی صاحب کے گھر جانا تو پہلے ہی چھُوٹ چکا تھا اور کالج وہ جگہ تھی جہاں وہ.... بالکل ایک الگ ماحول میں سانس لیتی تھی۔ اس ماحول میں تازگی تھی اور پاکیزگی بھی اور زیب النسا بھی۔

اگرچہ زیب النسا اس سے ایک درجہ آگے تھی لیکن دونوں میں دوستی بہت تھی اور یہ دوستی اسکول کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔

زیب النسا وہ واحد لڑکی تھی جو اس کے پس منظر سے واقف تھی لیکن پھر بھی اسے اپنا بہترین دوست سمجھتی تھی۔ بہت پہلے جب وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اسے شہزادی کے متعلق پتا چل گیا تھا۔

زیب النسا کو شہزادی کی سالگرہ کا گفٹ دینے اس کے گھر جانا تھا ان جیسی متوسط گھرانے کی لڑکیوں میں سالگرہ منانے کا رواج نہیں تھا لیکن لڑکیاں اپنی دوستوں کو اسکول میں چھوٹے موٹے گفٹ دیا کرتی تھیں۔ شہزادی نے بھی اسے گفٹ دیا تھا اور اب وہ جانا چاہتی تھی اس نے شہزادی کے لیے چوڑیاں اور ٹاپس خریدے تھے لیکن ابا نے اسے منع کردیا تھا اور بہت رسان سے سمجھا دیا تھا کہ وہ وہاں نہیں جاسکتی لیکن انہوں نے اسے شہزادی سے بات کرنے یا دوستی رکھنے سے منع نہیں کیا تھا۔ سو زیب النسا نے اگلے دن اُسے اسکول میں ہی گفٹ دے کر وعدے کے مطابق اس کے گھر نہ آسکنے کی وجہ بتادی تھی جبکہ رانی نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ زیب النسا ..... کا انتظار نہ کرے وہ نہیں آئے گی لیکن زیب النسا .... اس کی سہیلی تھی وہ اس کے گھر نہیں آسکتی تھی لیکن شہزادی تو جاسکتی تھی ناں سو وہ زیادہ تو نہیں بس دو تین بار اس کے گھر گئی تھی سات آٹھ سالوں میں کتنا جی چاہتا تھا اس کا کہ پہلے کی طرح وہ ہر روز ان کے گھر جائے اور ہر روز وہاں کی کوئی ایسی بات جو اس کے گھر میں نہیں تھی دل میں سجا کر لے آئے لیکن اب وہ قرآن پاک ختم کرچکی تھی شاید استانی جی اور مولوی صاحب بھی اس کا آنا پسند نہ کرتے پھر اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا اسے ریاض کرنا ہوتا تھا، پڑھنا ہوتا تھا اور پھر اسے رانی اور مشتری سے بھی سیکھنا ہوتا تھا تو وہ صرف تین چار بار ہی ان سارے سالوں میں اس کے گھر گئی تھی۔ ایک بار جب زیب النسا نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ وہ مٹھائی کا ڈبا لے کر آئی تھی۔ اس گھر میں آنے کا اس کا ہمیشہ ہی بہت دل چاہتا تھا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا اور وہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا کیونکہ بچیاں آگے پیچھے قرآن پاک پڑھنے کے لیے آتی رہتی تھیں لیکن اس روز ابھی بچیوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن دروازے پر پھر بھی کنڈی نہیں لگی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی۔ سامنے ہی برآمدے میں تخت پر عبدالرحمٰن استانی جی کی گود میں سر رکھے نیم دراز تھا اور استانی جی اس کے بالوں میں بہت پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ آہٹ پر عبدالرحمٰن سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ ہلکی، ہلکی مونچھیں اور چھوٹی سی داڑھی...... یہ عبدالرحمٰن کتنا بڑا ہوگیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ پھر عبدالرحمٰن اٹھ کر اندر کمرے میں غائب ہوگیا اور وہ جیسے چونک پڑی۔ استانی جی اسے آگے آنے کو کہہ رہی تھیں۔

”ارے بیٹی کھڑی کیوں ہوگئی ہو آجاؤ۔“

اور پھر وہ زیب النسا کو آواز دینے لگی تھیں۔

”ارے زیب دیکھو کون آیا ہے؟“ کتنا مکمل اور کتنا بھرپور منظر تھا جو اس کی آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ ماں اور بیٹا...... یہ منظر اسے اپنے گھر میں کہیں

نظر نہیں آیا تھا اور پھر پہلی بار اس نے خواب دیکھا تھا ایک چھوٹا سا گھر صاف ستھرا سا اور تخت پوش پر وہ بیٹھی ہے گود میں ایک پیارے سے بچے کو لیے اور پاس ہی کرسی پر بیٹھا عبدالرحمٰن محبت سے انہیں تکتا ......اور تب وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں پہلی بار عبدالرحمٰن اس کے خوابوں میں آیا تھا اور اب اٹھارہ سال کی عمر تک متعدد بار منظر بدل، بدل کر یہ خواب آتا رہا۔ کبھی وہ عبدالرحمٰن کے سامنے کھانا رکھ رہی ہے، کبھی اس کے کپڑے استری کر رہی ہے، کبھی چھوٹے سے گھر میں جھاڑو دے رہی ہے اور عبدالرحمٰن بچہ اٹھائے کھڑا ہے۔

''کیا اسے عبدالرحمٰن سے محبت ہو گئی ہے؟'' اس نے کئی بار اپنے دل کو ٹٹول، ٹٹول کر خود سے پوچھا تھا۔ اس نے ابھی نئے، نئے ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تھے اور لفظ محبت سے نئی، نئی آشنا ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے بھلا عبدالرحمٰن کو دھیان سے دیکھا ہی کب تھا وہ جھپاک سے اندر چلا گیا تھا۔ دراصل اس کا دل عبدالرحمٰن کی محبت میں نہیں اس گھر کی محبت میں ہمکتا تھا جس میں عبدالرحمٰن رہتا تھا اور دوسری بار وہ زیب النسا کے اصرار پر میلاد شریف میں شرکت کے لیے ان کے گھر گئی تھی۔ اس نے زیب النسا سے پوچھا تھا۔

''استانی جی اور مولوی صاحب کو میرے نعت پڑھنے پر اعتراض تو نہیں ہوگا ناں؟'' اب وہ بچی تو نہیں تھی جانتی تھی کہ وہ چھوت کا ایسا مرض ہے جس سے شریف لوگ دور بھاگتے ہیں لیکن یہ گھرانا عجیب گھرانا تھا۔ نہ استانی جی نے اسے قرآن پڑھانے سے انکار کیا نہ اس سے بات کرنے کو زیب النسا کو منع کیا اور اب زیب النسا چاہتی تھی۔ وہ علامہ اقبال کی وہی نعت پڑھے جسے ٹیچرز فرمائش کر کر کے اس سے سنتی تھیں اور استانی جی یا مولوی صاحب نے بالکل منع نہیں کیا تھا۔ سو وہ آئی تھی اور اس نے نعت پڑھی تھی جب وہ نعت پڑھ رہی تھی تو باہر سے گزرتا ہوا عبدالرحمٰن ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر''

آواز تھی یا کوئی جادو تھا جس نے عبدالرحمٰن کے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

وہ اس وقت تک سحر زدہ سا کھڑا رہا جب تک نعت ختم نہ ہوئی تھی اور جب رات کو کھانا کھاتے ہوئے اس نے زیب النسا سے پوچھا تھا۔

''یہ نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے والی نعت کون پڑھ رہا تھا؟''

''شہزادی تھی۔'' زیب النسا نے بتایا تھا اور لقمہ اس کے ہاتھ سے نیچے پلیٹ میں گر پڑا تھا اور جب صبح کالج میں زیب النسا نے شہزادی کو بتایا کہ عبدالرحمٰن پوچھ رہا تھا کہ یہ نعت کون پڑھ رہا تھا تو شہزادی تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی اور اس رات پھر اس نے خواب دیکھا تھا وہ عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ عبدالرحمٰن وہ اور ان کے بچے۔ یہ وہ خواب تھا جسے وہ بار بار دیکھنا چاہتی تھی پھر بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہے۔

نیچے گلی میں کوئی کتا زور سے بھونکا تھا اور رانی نے کروٹ بدل کر اس کے بیڈ کی طرف دیکھا تھا اور پھر سائڈ ٹیبل پر پڑے لیپ کا بٹن دبا دیا تھا اور شہزادی کا خالی بیڈ دیکھ کر یک دم اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''شہزادی۔'' اس کے منہ سے گھٹی، گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ شہزادی نے مڑ کر دیکھا۔

''کیا ہے رانی؟''

''اوہ۔'' رانی نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ ''تم وہاں اندھیرے میں کھڑی کیا کر رہی ہو اور تم سوئی نہیں ابھی تک۔۔ چار بج رہے ہیں۔''

شہزادی کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ''میں تو تمہارا خالی بیڈ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔''

''کیوں، تم نے سمجھا میں بھاگ گئی ہوں؟''

''نہیں خیر اس طرح تو نہیں سوچا۔'' وہ کچھ جھینپی، جھینپی سی آواز میں بولی اور پھر لیٹ گئی۔

''بھگانے والا کوئی ہو تو بھاگ بھی جاؤں رانی، ایک لمحہ نہ رکوں۔ کوئی امیر زادہ تو کیا یہاں تو کوئی بھکاری بھی بھگا لے جانے کو تیار نہ ہو۔'' اس نے سوچتے ہوئے رانی کی طرف دیکھا جس نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور کروٹ بدل لی تھی۔

''تم بھی سو جاؤ۔'' رانی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آف کیا۔ شہزادی کی آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگ رہی تھیں لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ چار بجے سوئی تھی پھر بھی اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے دھوپ چھن، چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے بازو آنکھوں پر رکھ لیا لیکن دھوپ تو جیسے آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رانی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ایک دو بجے سے پہلے نہیں اٹھتی تھی لیکن کالج جانے کی وجہ سے اسے جلدی اٹھنے کی عادت تھی پھر صبح، صبح وہ اٹھ کر کچھ ریاض بھی کر لیتی تھی۔ بیڈ پر بیٹھے، بیٹھے اس کی نظر رانی کے بیڈ کے پاس نیچے پڑے گھنگروؤں پر پڑی۔ رانی جب رقص کرتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے آس پاس کی ہر شے تھم گئی ہو۔ اس کے اندر جیسے بجلی بھری تھی لیکن وہ...... اس کا تو ایک قدم بھی سیدھا نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے استاد جی نے ہار مان لی تھی۔

اس نے کبھی گھنگرو نہیں باندھے تھے۔ اسے

غزل

وہ یار جو ہے مجھے حسبِ حال دیتا ہے
عروج دن کو تو شب کو ملال دیتا ہے

مجھے ذرا سا بھروسا نہیں ہے اب اس پر
وہ میری بات ہوا میں اچھال دیتا ہے

اسے پسند نہیں ہے میری ہنسی شاید
ہر اِک خوشی وہ مری غم میں ڈھال دیتا ہے

میری سمجھ میں جواب اس کا کچھ نہیں آتا
وہ لمحہ، لمحہ نیا اِک سوال دیتا ہے

اداس رہنے کی عادت جو ڈال دی اس نے
اب اس کا وصل بھی حُزن و ملال دیتا ہے

کبھی جو وعدے پہ اپنے کھرا نہیں اترا
وہ بے وفائی میں میری مثال دیتا ہے

مرے وجود کو کانٹوں کی نوک پہ رکھ کر
وہ آج غیروں کو الفت کی شال دیتا ہے

میری غزل میں بہت رنگ ہیں مگر دل سے
اسے وہ سنتا ہے سن کر نکال دیتا ہے

شاعر: آصف شہزاد
مرسلہ: ظلِ شاہین، ڈی جی خان

ساری زندگی گھنگرو باندھ کر بھوکی نظروں کے سامنے ناچنا نہیں تھا۔ وہ بیڈ سے اتری اور ہولے، ہولے قدموں سے چلتی ہوئی گھنگروؤں کے پاس رکی اور جھک کر گھنگرو اٹھا لیے۔ سرخ ساٹن کا پٹا۔

''اور ...... کیا مجھے بھی ایک دن یہ گھنگرو باندھنے پڑیں گے؟'' اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ جل رہے ہوں۔ اس نے یک دم گھنگرو نیچے پھینک دیے جو ہلکی سی آواز کے ساتھ قالین پر گرے تھے۔ وہ کچھ دیر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر مڑ کر بیڈ سے دوپٹا اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر کھڑکی کی طرف بڑھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر تیز تیز سانس لی جیسے دم گھٹ رہا ہو۔ گلی اب بھی خاموش اور ویران تھی۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر دیکھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کوئی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یکا یک وہ اٹھا اور اس نے سر اٹھا کر اوپر شہزادی کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا۔ کیا یہ وہی رات والا تھا جو رات گلی میں کبھی بلند اور کبھی آہستہ آواز میں گاتا تھا۔ اس نے مڑ کر گہری نیند سوئی ہوئی رانی کو دیکھا۔

''یہاں زندگی سوئی ہوئی تھی اور وہاں زیب النسا ..... اور عبدالرحمٰن کے گھر زندگی جاگ رہی ہوگی۔ متحرک ......زندہ...استانی جی گرم، گرم پراٹھے پکا رہی ہوں گی، عبدالرحمٰن ، زیب النسا اور مولوی صاحب چولھے کے قریب ہی پیڑھیوں پر بیٹھے ناشتا کر رہے ہوں گے۔ زیب کپوں میں چائے ڈالتی ہوگی۔ آہ...... وہاں زندگی جیتی ہے اور یہاں مرتی ہے پھر ناشتے کے بعد زیب اور عبدالرحمٰن اپنے کالج چلے جائیں گے اور استانی جی کھُرے کے پاس بیٹھ کر برتن دھوئیں گی اور صبح کے وقت آنے والی بچیاں برآمدے میں بیٹھی ہل، ہل کر بلند آواز میں سپارے کا سبق یاد کرتی ہوں گی۔'' وہ پھر عبدالرحمٰن کے گھر جا پہنچی تھی۔

اس روز وہ تیسری بار زیب النسا کے گھر گئی تھی۔ اس نے زیب النسا سے گرائمر اور کمپوزیشن کی کتاب لی تھی اور ہر روز کالج لے جانا بھول جاتی تھی۔ اس نے سوچا تھا آج وہ گھر ہی دے آئے۔ گھر کون سا دور تھا۔ گلی سے باہر نکلو تو شاہی مسجد اور شاہی مسجد کے عقب میں شاہی قلعے سے پہلے ایک گلی میں زیب النسا کا گھر تھا تو وہ اسے کمپوزیشن کی کتاب واپس کرنے آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح صحن کا دروازہ دھکیل کر صحن میں آئی تھی۔ سامنے برآمدے میں عبدالرحمٰن کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

اس روز اس نے وہی میلاد کے دن والا لباس پہنا ہوا تھا۔ سفید گھیر دار فراک پر ململ کا سفید کلف لگا دوپٹا جس پر کرن لگی تھی اور کلف کے ساتھ ابرق بھی تھی۔ جو رہ رہ کر چمکتی تھی۔

عبدالرحمٰن کھڑا ہو گیا تھا اور مبہوت سا اسے برآمدے کی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی برآمدے تک آئی تھی اور عبدالرحمٰن نے چونک کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''اماں اور زیب تو خالہ کے گھر گئی ہیں اور ابا مسجد میں ہیں۔'' وہ گھر میں اکیلا تھا۔

''یہ کتاب......'' اس نے کتاب آگے بڑھائی۔ ''زیب کو دینی تھی۔'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ عبدالرحمٰن نے کتاب تھام لی وہ واپس مڑی۔ عبدالرحمٰن وہاں ہی کھڑا رہا۔ صحن کے دروازے تک جاتے، جاتے وہ دو دفعہ رکی۔ دو بار مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شاید عبدالرحمٰن اسے روک لے اور عبدالرحمٰن کتاب ہاتھ میں لیے اسے دیکھتا تھا کہ شاید وہ رک جائے، کچھ کہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہا تھا لیکن دونوں کے دل ایک تال پر دھڑک رہے تھے۔ عبدالرحمٰن کہنا چاہتا تھا۔

''شہزادی تمہاری آواز بہت خوب صورت ہے، دل میں اتر جانے والی تم خود بھی خوب صورت ہو۔''

اور شہزادی کہنا چاہتی تھی۔ ''عبدالرحمٰن مجھے تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہنے کی تمنا ہے۔'' لیکن نہ شہزادی کچھ کہہ سکی نہ عبدالرحمٰن اور شہزادی گھر آگئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کاش میں عبدالرحمٰن کو اس روز بتا سکتی کہ مجھے اس کے گھر کی تمنا ہے۔''

باہر کھٹ پٹ ہوئی۔ خانو کی چپلیں گھسٹنے کی آواز اور برتنوں کی کھڑ کھڑ۔ اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تو صرف دس بجے تھے اور یہ کسی کے جاگنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے بیڈ کے پاس پڑی چپل پہنی اور سوتی ہوئی رانی کو دیکھتی کمرے سے باہر آئی۔ چاندنی ٹرے میں ناشتا لگائے سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی اور خانو اس کے پیچھے پیر گھسیٹتا چلتا تھا۔

''یا اللہ خیر ہو، یہ وقت مشتری کے جاگنے کا تو نہیں تھا۔'' اس نے جنگلے سے جھانک کر صحن میں دیکھا۔ نیچے بھی چہل پہل تھی۔ صبو کمرے سے باہر آ رہی تھی اور مشتری غسل خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ خانو اور چاندنی سیڑھیوں سے اتر چکے تھے وہ بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ڈیوڑھی کا صحن میں کھلنے والا دروازہ چوپٹ کھلا تھا وہ جلدی سے صحن سے ہوتی مشتری کے کمرے میں آئی وہ ناشتا کر رہی تھی۔

''آپ کو کہیں جانا ہے کیا؟''

''ہاں، داتا دربار جا رہی ہوں۔'' مشتری نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''تیری طبیعت اب کیسی ہے؟ میں نے رانی سے کہا تھا تجھے اسپتال لے جائے۔''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ ایک صوفے پر ٹک گئی۔

''لیکن مجھے اتنی ٹھیک نہیں لگتی...... خیر ابھی جا رہی ہوں ناں داتا صاحب، دعا کروں گی، منت بھی مانوں گی تیری پہلی ہی محفل کی دھوم مچ جائے۔ استاد جی کو تو بڑا یقین ہے۔'' مشتری نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''اگلے ہفتے تیرے لیے محفل رکھوں گی۔ استاد جی سے میں نے کہہ دیا ہے تجھے کلام منتخب کر کے دیں اور سن لیں تجھ سے۔''

''چلیں آپا...... میں تیار ہوں۔'' صبو برقع کے بٹن بند کرتے ہوئے اندر آئی۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' مشتری صافی سے ہاتھ پونچھ کر کھڑی ہوگئی۔

''خانو میرے ساتھ جائے گا چاندنی...... دو گھنٹے تک آجائیں گے ہم۔'' اور پھر وہ شہزادی کی طرف مڑی۔

''تو چلے گی ساتھ...... داتا صاحب......؟ بڑا سکون ملے گا...... دل ٹھہر جائے گا تیرا بھی۔''

''لیکن اماں وہ مجھے آج زیب النسا کی طرف جانا تھا...... رزلٹ کا پتا کرنا ہے مجھے...... کب تک آئے گا۔''

''لے تو نے اب کون سا پڑھنا ہے آگے جو رزلٹ کا پتا کرنا ہے تجھے۔'' مشتری ہنسی تھی۔

''خیر چلی جانا اور استانی جی کو میرا سلام دینا......'' اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ مشتری نے چاندنی کے ہاتھ سے برقع لیتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

''کیا یہ صرف زیب النسا سے ملنے کی خوشی ہے یا کچھ اور بھی ہے...... خیر......'' اس نے سر جھکا اور شہزادی کمرے سے باہر نکل آئی...... وہ بڑی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی اور اسی پھرتی سے تیار ہوئی تھی۔ چاندنی نے اسے ناشتے کے لیے روکا تھا۔

''ارے بیٹا خالی پیٹ مت نکلو گھر سے۔'' اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن چاندنی کی محبت کے آگے وہ ہمیشہ مجبور ہو جاتی تھی سو گھر سے نکلتے، نکلتے

گیارہ بج گئے تھے اس گھر میں ابھی ناشتا بھی نہیں ہوا تھا اور وہاں زیب النسا کے گھر میں دن کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی...... زیب النسا تخت پر کتابیں بکھرائے بیٹھی تھی۔ دو چار روز میں اس کے بی اے سال اول کے پرچے ہونے والے تھے اور استانی جی باورچی خانے میں تھیں...... زیب النسا اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔

''تم بیٹھو ذرا ادھر شہزادی' میں یہ سوال یاد کروں پھر بات کرتی ہوں۔''

''نہیں...... تم اپنا پڑھو...... جب فارغ ہو جاؤ تو باتیں کرلیں گے، میں تو استانی جی کے پاس جا رہی ہوں۔'' استانی جی سبزی کاٹ رہی تھیں اس نے مٹر کی ٹوکری اپنی طرف کرلی اور مٹر چھیلنے لگی...... استانی جی آلو کاٹ رہی تھیں۔

''عبدالرحمٰن کو مٹر آلو کی بھاجی بہت پسند ہے۔''

''اور مجھے تو مٹر آلو کی بھجیا کیا کچھ بھی پکانا نہیں آتا لیکن خیر سیکھ لوں گی۔'' اس کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی...... استانی جی نے ایک نظر اسے دیکھا اور سوچا کتنی پیاری ہیرا سی لڑکی ہے اور کہاں جنم لیا... بدنصیب نے...... ان کے چہرے پر تاسف تھا دکھ تھا اور وہ جانے کن خوابوں میں کھوئی مٹر چھیل رہی تھی...... مٹر ختم ہو گئے تھے اس نے پیاز اٹھائی تب ہی کمرے کی چق اٹھا کر عبدالرحمٰن سر جھکائے آستینوں کے بٹن بند کرتا باورچی خانے تک آیا تھا۔

''جی اماں اب بتائیں کیا، کیا منگوانا ہے۔'' عبدالرحمٰن گھر پر تھا اور وہ سمجھ رہی تھی یونیورسٹی میں ہوگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا...... نظریں ملیں اس نے نظریں جھکالیں۔ عبدالرحمٰن ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''فہرست بنادی ہے زبین نے' لے لو اس سے اور ہاں ٹھہرو...... کچھ دوپٹے بھی رنگوانے تھے۔'' وہ اٹھیں۔ ''میں لے کر آتی ہوں۔''

شہزادی نے ہاتھ میں پکڑی پیاز کا چھلکا اتارا اور کاٹنے لگی۔

''شہزادی......'' عبدالرحمٰن نے چیخ چیخ اسے پکارا تھا یا کان بجے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا...... وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا...... اور پتا نہیں کیسے تیز چھری نے شہادت کی انگلی پر گہرا کٹ لگا دیا۔ بھل بھل خون بہنے لگا...... عبدالرحمٰن نے...... بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور انگلی کو اپنے ہاتھ سے دبا کر خون روکنے کی کوشش کی اور وہ اپنے سامنے دوزانو بیٹھے عبدالرحمٰن کو ایک ٹک دیکھتی رہی اور اس کی نظریں عبدالرحمٰن کے چہرے سے ہٹ کر اس کے ہاتھوں پر جمی تھیں خوب صورت مردانہ ہاتھ...... دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

''زیب...... زیب جلدی سے پٹی اور اسپرٹ، آیوڈین جو بھی ہے لے کر آؤ شہزادی کی انگلی کٹ گئی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے یونہی ہاتھ پکڑے، پکڑے مڑ کر برآمدے میں بیٹھی زیب کی طرف دیکھا تھا۔

کاش وقت یہیں کہیں ٹھہر جائے......

عبدالرحمٰن ایسے ہی اس کا ہاتھ تھامے رہے وہ یونہی اس باورچی خانے میں بیٹھے، بیٹھے اپنی آخری سانس لے لے...... عبدالرحمٰن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور کھڑا ہو گیا۔

''زیب آرہی ہے...... پٹی باندھ دیتی ہے۔'' وہ تیزی سے صحن عبور کرتا ہوا برآمدے میں کمرے کے دروازے تک آیا تھا اور استانی جی سے دوپٹوں والا شاپر پکڑ کر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

زیب النسا اس کی انگلی پر پٹی باندھ رہی تھی اور وہ سوچتی تھی جیسے یکایک وہ تہی داماں ہو گئی ہے...... خالی ہو گئی ہے۔ کسی نے اس کا بھرا خزانہ چھین لیا ہے...... ابھی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھا تو وہ یک دم مالدار ہو گئی تھی...... امیر...... خزانے کی مالک......

''اف...... شہزادی کیسے کاٹ لیا...... تمہیں کیا

ضرورت تھی پیاز کاٹنے کی...... بھلا پہلے کبھی پیاز کاٹی ہوگی تم نے؟''

''تم یونہی پریشان ہو رہی ہو زیب...... اتنا بڑا زخم نہیں ہے۔''

''نہیں خیر کافی گہرا کٹ لگا ہے، خون دیکھو ناں بند ہی نہیں ہو رہا۔'' زیب النسا نے کس کے پٹی باندھ دی تھی۔

''یہ عبدالرحمٰن کو کیا ہوا شاپر پکڑا اور یہ جا وہ جا...... سودے کا پرچہ ویسا کا ویسا ہی پڑا ہے۔'' استانی جی بڑبڑاتی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کی انگلی کٹ جانے پر افسوس کیا تھا اور اسے زیب النسا کی شادی کا بتایا۔

''امتحانوں کے بعد اس کی شادی ہے شہزادی...... رات میں میری بہن اور بہنوئی نے تاریخ لینے آنا ہے شادی کی...... تو کچھ چیزیں منگوانی تھیں...... اب رات میں دوڑاؤں گی کیا......''

''آجائے گا اماں خود ہی دوسری بار جانا پڑے گا۔'' زیب النسا ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی تھی۔

''چلو وہاں برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''تم خوش ہو زیب؟'' اور زیب النسا کی آنکھوں میں جگنو اتر آئے تھے۔ شرمیلی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا...... وہ کتنی خوش تھی اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

''اور تمہارا بی اے......؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک سال ہی تو رہ جائے گا تو وہ شادی کے بعد کرلوں گی...... خالہ کو اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی تنویر کو...... لیکن تم...... کیا تمہاری اماں نے اجازت دے دی تمہیں آگے پڑھنے کی؟''

''نہیں زیب...... اماں میری پڑھائی کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتیں...... بہ مشکل گزارہ ہوتا ہے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''لیکن......؟'' زیب کو حیرت ہوئی۔ ''میں تو سمجھتی تھی تم لوگوں کے پاس بہت پیسہ ہوتا ہوگا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے، زیب، ہم گانے والیاں ہیں، صرف گانے والیاں...... اور آج کل گانے وغیرہ سننے کم ہی لوگ آتے ہیں بلکہ نہ آنے کے برابر...... چاندنی کہتی ہے یہ نوابوں، مہاراجوں کا دور نہیں ہے...... ورنہ پہلے تو گانے والیوں کے چوبارے کبھی ویران نہیں ہوتے تھے۔ اب تو کسی نے شادی بیاہ کی محفل میں بلوالیا یا کسی فنکشن پر ورنہ گھر تو......''

زیب النسا حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی یوں کھل کر بات نہیں کی تھی۔

''ہمارا علاقہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصے میں ہم جیسی ہی ہیں...... اور ان کا حال کم و بیش ہم جیسا ہی ہے...... اور دوسرے حصے میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ چاندنی نے اسے بتایا تھا اس کی نانی راول پنڈی میں پہلے قسائی گلی میں رہتی تھیں۔ گلاب پری کے چوبارے میں دور، دور سے لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔ ایک سے ایک گانے والی تھی اس چوبارے میں پھر پتا نہیں وہاں سے بلیوں کی سراں میں کیسے پہنچی اور وہاں سے میجر پارسن کے پاس...... سنا تھا میجر پارسن نے اس سے شادی کی تھی اور مسلمان ہو گیا تھا۔ اللہ جانے سچ تھا یا جھوٹ......''

زیب النسا کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی...... پھر ہولے سے بولی۔

''خیر تم میری کتابیں لے جانا...... پڑھ کر پرائیویٹ امتحان دے دینا، میں بھی تمہاری مدد کردوں گی...... بلکہ تم بی اے کر کے بی ایڈ کر کے کسی اسکول میں ٹیچر لگ جانا...... اور کسی اچھی جگہ...... میرا مطلب ہے یہ محلہ چھوڑ دینا۔''

شہزادی کے دل کو یہ بات لگی تھی اور جب اس نے یہ بات مشتری سے کہی تھی مشتری بہت دیر تک

چپ بیٹھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

"اماں ہم گانا گا کر پیسہ کماتے ہیں ناں تو اگر میں ٹیچر بن جاؤں تو بھی پیسے کما لوں گی...... پہلی صورت میں تمہاری عزت نہیں ہے...... لوگ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے...... دوسری صورت میں لوگ ہمیں اچھا سمجھیں گے ہماری عزت کریں گے۔"

"تم ابھی بہت چھوٹی ہو شہزادی صرف اٹھارہ سال کی...... اور تم خوابوں کی باتیں کرتی ہو...... لوگ تمہیں وہ عزت نہیں دیں گے جس کے خواب تم دیکھ رہی ہو...... اسے تلاشتے، تلاشتے تم تھک جاؤ گی...... تمہارے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے تمہارا وجود زخم، زخم ہو جائے گا لیکن یہ عزت نہیں ملے گی تمہیں۔"

"اماں اگر کوئی شریف آدمی مجھ سے اور رانی سے شادی کر لے کیا تب بھی عزت نہیں ملے گی ہمیں؟"

"کیا کوئی ہے......؟" مشتری کی آنکھیں اسے اندر تک کھوج رہی تھیں۔

"نہیں......" وہ سٹپٹائی...... "لیکن کوئی ہو بھی تو سکتا ہے ناں......"

"جب کوئی ہو تو پھر بتانا...... اور اب جا استاد جی انتظار کر رہے ہیں...... ریاض کر لے جا کر...... اور یہ پڑھائی وڑھائی کی باتیں بھول جا اب۔" مشتری کا لہجہ سخت ہوا تھا لیکن آنکھوں میں اندر کہیں نمی سی تیرتی رہی تھی...... شہزادی گیلی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"کہیں مولوی کے بیٹے سے تو آنکھ مٹکا نہیں کر لیا......" چاندنی کا اپنا مخصوص لہجہ تھا اور انداز اور ڈیوڑھی کی طرف جاتی شہزادی نے برا سامنہ بنایا...... چاندنی کا اس طرح کا لہجہ اور اندازِ گفتگو اسے ہمیشہ ہی ناگوار گزرتا تھا۔

"نہیں...... مجھے نہیں لگتا......" مشتری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ بھی تو اس دور سے گزری تھی...... ماضی سینما کی اسکرین کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا...... اس نے بھی ایک روز جہاں آرا کی گود میں سر رکھ کر کہا تھا۔

"اماں مجھے گانا نہیں گانا...... مجھے دلہن بننا ہے۔" اس نے ٹی وی پر ڈراموں میں لڑکیوں کو دلہن بنے دیکھا تھا۔ جہاں آرا نے آہستہ سے اس کا سر گود سے ہٹا دیا تھا...... اور رنگو کو آواز دی تھی...... اور ڈپٹا تھا۔

"ابھی تک کیا سکھایا ہے تم نے لفظوں کی ادائیگی پر غور کرو...... سُر دیکھو اوپر نیچے...... اور سانس ایسے چڑھ جاتی ہے جیسے پہاڑی پر چڑھ رہی ہو اب تب ہی میرے سامنے لانا جب کسی قابل ہو......"

جہاں آرا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی لیکن مشتری کے دل میں تو گھر بسا کر رہنے کی خواہش ہمیشہ ہمکتی رہی...... اور اس نے دو بار کوشش بھی کی تھی گھر بسانے کی...... پہلے رامو اور اس کے جانے کے سات سال بعد جب یقین ہو گیا کہ مر کھپ گیا ہوگا تو شیرو کے کہنے پر مولوی صاحب سے پوچھ کر دوسری بار شیرو کوچوان کے ساتھ چپکے سے نکاح پڑھا کر اس کے ساتھ چلی گئی تھی پھر دسویں دن ہی اس کے بیوی بچوں کو پتا چلا اور انہوں نے مار پیٹ کر شیرو کو طلاق دینے پر مجبور کر دیا اور جس خاموشی سے گئی تھی اسی خاموشی سے گیارھویں دن واپس آ گئی...... کسی کو خبر تک نہیں ہوئی ایک چاندنی تھی جو سب جانتی تھی...... تو یہ ظالم خواہش اب شہزادی کے دل میں پیدا ہوئی تھی...... باعزت ــ زندگی کی خواہش دونوں ہی صورتیں مشکل تھیں۔

شیرو کے ساتھ دس دن اس نے ایک بالکل گرہستن عورت کی طرح گزارے تھے۔ چھوٹا سا ایک کمرے کا گھر شیرو نے اچھرے میں کرائے پر لیا تھا...... صبح اٹھ کر اس گھر میں جھاڑو دینا...... تیل کے چولھے پر شیرو اور اپنے لیے چائے بنانا...... اور دن کو کوئی سبزی، دال پکانا جو ایک بار بھی اچھی نہیں بنی تھی

لیکن شیرو نے خوش ہو کر کھائی تھی، تعریف کی تھی...... اسے شیرو سے محبت ہو گئی تھی اور اگر شیرو کی بیٹی عزت کی زندگی کی خواہش مند تھی تو......

☆☆☆

اگلی جمعرات کو اس نے پھر داتا صاحب جا کر نیاز کی دیگ دی تھی کہ شہزادی کو کوئی شریف آدمی مل جائے جو اسے گھر میں بسا لے۔

پچھلی جمعرات کو اس نے منت مانی تھی کہ شہزادی کا نام ہو اس کے طفیل چوبارہ چمک اٹھے...... اس کی آواز جادو کر دے اور اس جمعرات کو...... لیکن کوئی شریف آدمی شہزادی کو کہاں ملنا تھا...... بس ــ عبدالرحمٰن تھا جو بات نہیں کرتا تھا لیکن جب بھی جاتی دور دور سے دیکھتا تھا...... اور اس دیکھنے کو زیب النسا نے بھی دیکھا تھا۔ اسے شہزادی اچھی لگتی تھی وہ اس کی سہیلی بھی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں رہتی ہے اور اس روز پتا نہیں کیوں اس نے عبدالرحمٰن سے پوچھ لیا تھا۔

"یہ شہزادی جہاں رہتی ہے اسے شاہی محلہ ہی کیوں کہتے ہیں...... کیا یہاں پہلے شاہی خاندانوں کی اجڑی۔ بچھڑی عورتیں بھی لائی جاتی تھیں......؟ زوال کے بعد...... بے چاری عورتیں......" پتا نہیں کیوں اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ کیا خبر شہزادی بھی کسی شاہی نسل کی ہو۔

اور ذرا فاصلے پر بیٹھے مولوی صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ وہ تمام مولویوں سے مختلف تھے۔ ان سے کراہیت نہیں کرتے تھے...... لیکن انہوں نے پاس بیٹھی استانی جی سے کہا۔

"زیب النسا کو سمجھا دو اب وہ جوان ہے کل کو اس کی شادی ہونی ہے، یہ شہزادی سے دوستی اب ختم کر لے...... میں نہیں چاہتا کہ وہ اب یہاں آیا کرے۔" ان کی آواز آہستہ ہوئی تھی۔

"عبدالرحمٰن بھی جوان ہے...... کل کلاں کو...... ہم شریف لوگ ہیں۔" اور استانی جی نے سر ہلا دیا

زندگی اے زندگی

☆ زندگی صرف ایک ہم ہی تک محدود نہیں بلکہ ہم سے وابستہ تمام رشتے، تمام تعلق، تمام ناتے اسی بھرپور انداز سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہم خود چاہتے ہیں۔ سو ہر لمحہ جب ہم اپنی بہتری کے حصول کے لیے صَرف کر دیتے ہیں تو کیوں نہ ہم دوسروں کی بہتری بھی برابر سے چاہیں، یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم مثبت اندازِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کریں، اسی طرح ہم اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار سکتے ہیں......

☆ دنیا میں ہم ایک اچھے دوست، ایک اچھے ساتھی اور ایک پُرخلوص رہنما کے متلاشی رہتے ہیں کیوں نہ ہم یہی تمام صفات اپنے میں پیدا کریں تاکہ دوسرے بھی اس تلاش سے استفادہ حاصل کریں۔

☆ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا...... یہ تو مشہورِ زمانہ مصرع ہے مگر کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کی کوشش اور بے غرض ہو کر دوسروں کے لیے کامیابی کی راہیں ہموار کرنا... ہرگز مر مر کے جیے جانے کے مترادف نہیں بلکہ ایسے جینے میں ہم سُرور بھی حاصل کر سکتے ہیں جو بعدِ حیات بھی ملتا رہے گا۔

مرسلہ نگار: نگہت زیدی، بہارہ کہو

تھا...... ذرا فاصلے پر بیٹھے عبدالرحمٰن اور زیب النسا نے سب سنا تھا اور جہاں زیب النسا کا رنگ ماند ہوا تھا۔ وہاں عبدالرحمٰن کا بھی دل ڈوب گیا تھا...... اور اس نے سوچا تھا...... "اس کے یہاں آنے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے...... میں کوئی نادان، بے وقوف

ہوں...؟" مولوی صاحب اٹھ کر چلے گئے تھے اور اپنے خیالات کو جھٹکنے کے لیے اور شہزادی کے تصور سے بچنے کے لیے عبدالرحمٰن نے آہستگی سے زیب النسا ....کو بتایا تھا۔

"یہ جو انگریز تھے ان کا وتیرہ تھا کہ جہاں، جہاں انہوں نے قبضہ کیا اور فتوحات کیں...... وہاں ایسے علاقوں میں جہاں شاہی خاندان کے وزرا اور امرا وغیرہ رہتے تھے وہاں ایسی عورتوں کو بسا دیا...... شاید اس طرح شکست خوردہ حکمرانوں کی تذلیل مقصود ہو...... اس کے سرے پہ اب یہ شاہی مسجد ہے عقب میں شاہی قلعہ تو یقیناً پہلے یہاں امرا اور دربار سے منسلک لوگ رہتے ہوں گے...... شاہی محلہ پرانا نام ہے اب کچھ اور ہے......" زیب النسا کے سامنے اس کا موجودہ نام لیتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی تھی۔ "اور یہ صرف برصغیر میں نہیں یورپ میں بھی جہاں کہیں انہوں نے فتوحات کیں...... جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں سینٹ پولی ایک جگہ ہے جہاں چرچ ہی چرچ تھے...... ہٹلر کی شکست کے بعد انہوں نے اس علاقے کو ایروسنٹر بنا دیا...... یورپ کا سب سے بڑا ایروسینٹر ہے وہ آج کل۔" زیب النسا حیرانی سے اس کی بات سن رہی تھی...... عبدالرحمٰن نے اس سے پہلے کبھی اتنی اور ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔

"شہزادی اچھی ہے لیکن......" اس کی آواز آہستہ ہوگئی تھی اور وہ انگلیاں چٹخانے لگا تھا۔

"وہ بہت اچھی ہے اس نے امی جی سے قرآن پاک پڑھا ہے اور نعت...... نعت کس طرح ڈوب کر پڑھتی ہے۔"

"تو......؟" عبدالرحمٰن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مولوی صاحب جا چکے تھے اور استانی جی خاموش بیٹھی کروشیے سے دوپٹے پر بیل بنا رہی تھیں۔

"تو......؟" زیب النسا کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"اگر وہ وہاں سے نہیں آتی تو میں اسے اپنی بھابی بنا لیتی۔ سچ بتانا عبدالرحمٰن بھائی آپ کو کیسی لگتی ہے وہ؟"

"وہ......وہ اچھی ہے۔" اس نے تھوک نگلا۔ "تو ظاہر ہے اچھی لگتی ہے۔"

"تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ اس سے شادی کرلیں؟" اس کا دل چاہتا تھا پر وہ ابھی تک خود سے بھی نہیں کہہ سکا تھا، زیب النسا کو کیا بتاتا۔

"اس سے شادی کر کے اسے باعزت زندگی دینا تو نیکی ہوگی ناں...... ابا بھی تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی گناہ گار نیکی کے راستے پر چلنا چاہے تو اس کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔"

"ہاں لیکن کیا پتا اسے ہی ایسی باعزت زندگی کی خواہش نہ ہو۔" اس نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آواز اور آہستہ کرلی تھی۔

"اسے ایسی زندگی کی بہت چاہ ہے۔" زیب النسا ....پُرجوش ہوئی تھی۔ "بارہا اس نے مجھ سے کہا ہے کہ کاش وہ ہمارے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی۔" عبدالرحمٰن کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔

"اچھا ایسا کہا تھا اس نے؟"

"ہاں، مجھے لگتا ہے وہ آپ کو پسند کرتی ہے اگر وہ آپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہے تو کیا آپ اس سے شادی کرلیں گے؟"

"میں......ہاں......" اس وقت اس کا یہی خیال تھا کہ اگر اس نے ایسا چاہا، عزت کی زندگی گزارنی چاہی تو وہ ضرور اس کا ہاتھ تھام لے گا لیکن جب اس نے اس سے التجا کی۔

"مجھ سے شادی کرلیں آپ...... میں گھر بسا کر رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک گھر کی بڑی چاہ ہے۔" تو وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔

"میں...... میں بھلا تم سے کیسے شادی کرسکتا ہوں۔ میں مولوی عبدالمنان کا بیٹا...... لوگ کیا کہیں گے۔" وہ ایک دم تیزی سے مڑا تھا اور چق اٹھا کر

کمرے میں چلا گیا تھا اور وہ برآمدے میں تنہا کھڑی رہ گئی تھی پھر اس نے حسرت سے اس گھر کو آخری بار دیکھا اور زیب النسا سے ملے بغیر جو باورچی خانے میں چائے بنانے گئی تھی اس گھر سے باہر آگئی۔

مشتری نے کئی دن اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ وہ چپ چاپ ریاض کر کے اندر کمرے میں گھس کر کھڑکی سے باہر جھانکتی رہتی۔

"سنو شہزادی! بہت دنوں سے زیب النسا سے تم ملنے نہیں گئیں؟"

"اس کی شادی ہونے والی ہے اماں، شادی کی تیاری میں مصروف رہتی ہے۔"

"اچھا کب ہے، تم جاؤ گی اس کی شادی میں بلایا ہے تمہیں؟"

"نہیں...... میں جا کر کیا کروں گی اماں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے آنسو چھپائے تھے۔ مشتری کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی تھی۔

"چاندنی، ملک صاحب اور خان صاحب کو اطلاع بھجوا دو۔ اگلے اتوار کو شہزادی گانا گائے گی۔ بہت شوق تھا انہیں شہزادی کا گانا سننے کا۔ استاد جی نے تعریف ہی اتنی کی تھی۔" اوپر شہزادی کھڑکی کا پٹ کھولے گلی میں جھانکتی رہی تھی۔ آج اسٹریٹ لیمپ کی روشنی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی جس سے ٹیک لگائے شاید اُسی روز والا منچلا بیٹھا وقفے، وقفے سے سر اٹھا کر سامنے دیکھتا جا رہا تھا اور گاتا جاتا تھا۔

"تھا یقیں کہ آئے گی یہ راتاں کبھی"

کبھی اس کی آواز بلند ہوتی کبھی آہستہ۔ پتا نہیں وہ کون تھا لیکن اب وہ اسے اکثر کھڑکی میں سے دیکھتی تھی۔ کبھی اس گلی میں کبھی اس گلی میں، کبھی کسی چوبارے کے سامنے دیوار سے یا دروازے سے کان لگائے سنتا ہوا۔ شاید وہ اندر سے آنے والی آوازیں سنتا ہو یا پھر......؟ شہزادی کا بڑا دل چاہتا تھا کہ کبھی وہ اس سے جا کر پوچھے کہ وہ یہاں ساری، ساری رات صبح ہونے تک کیوں چکراتا ہے لیکن صبح، صبح وہ غائب ہو جاتا تھا۔

شہزادی کی آواز اور گانے کی دھوم مچ گئی تھی۔ ملک صاحب قدردان تھے۔ اچھی آواز کے عاشق۔

"میں کہتا ہوں مشتری اسے ٹی وی، ریڈیو پر متعارف کرواؤ پھر دیکھنا تمہارے دن پھر جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کسی ڈرامے، فلم کی...ہیروئن بن جائے گی۔"

"گانے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن اداکاری اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بڑی سیدھی بچی لڑکی ہے میری، نہ ادائیں نہ نخرہ۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے...... بڑی سادی سی ہے۔ خیر میں بات کرتا ہوں کسی سے۔" ملک صاحب نے وعدہ کرلیا تھا۔ مشتری خوش تھی لیکن شہزادی مانو روبوٹ ہو...چابی کی مشین۔ مشتری کہتی تیار ہو جاؤ، تیار ہو جاتی۔ گانا، گانا ہے، گانا گا لیتی۔ مشتری کا دل اس کی حالت پر دُکھتا۔ محبت کی نشانی تھی۔ وہ اسے رانی سے زیادہ چاہتی تھی۔

"ارے کہیں روگ تو نہیں لگا بیٹھی۔ یہ بڑی بالی عمریا ہے۔" چاندنی اندازے لگاتی اور مشتری کچھ نہ سمجھ پاتی۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ ایک مولوی کا گھر، اس کا بیٹا تھا تو لیکن وہاں بھی کبھی دوڑ، دوڑ کر نہ گئی پھر بھی ایک روز پوچھ ہی بیٹھی۔

"شہزادی تو کیا سوچتی رہتی ہے ہر وقت؟ کیا یاد آتا ہے کوئی؟"

"نہیں اماں، کس نے یاد آنا ہے بھلا۔" عبدالرحمٰن کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ پتا نہیں اس نے عبدالرحمٰن سے محبت کی تھی یا نہیں۔ پتا نہیں وہ اسے یاد آتا تھا یا نہیں لیکن اس کا گھر ضرور یاد آتا تھا۔ چھوٹا سا گھر جہاں زندگی تھی، جیتی جاگتی، ہنستی ہوئی اور عبدالرحمٰن جو اسے میٹھی، میٹھی نظروں سے دیکھتا

جس نے چھری سے کٹ جانے پر ایک بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور کئی دن تک وہ اس ہاتھ کو چومتی رہی تھی پتا نہیں کیوں۔ کئی دن تک اس کے ہاتھ پر عبدالرحمن کے ہاتھوں کا لمس جیسے سانس لیتا رہا تھا۔ وہی عبدالرحمن اس روز چق اٹھا کر اندر کمرے میں چلا گیا تھا اور اس نے مڑ کر باورچی خانے کی طرف دیکھا تھا جہاں زیب النسا چائے بنا رہی تھی اور استانی جی بازار گئی ہوئی تھیں۔

اس نے دو قدم بڑی مشکل سے اٹھا کر چق اٹھائی تھی۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھا جھک کر بوٹوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے نظر اٹھائی تھی۔ وہ چق اٹھائے دروازے میں کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

”میں......ہم......میری اماں صرف گانا گاتی ہے۔ وہ طوائف نہیں ہے، جسم فروش نہیں ہے۔“ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ”تم مجھ سے شادی کرلو عبدالرحمن میں......“

”رہتی تو وہاں ہی ہو ناں اسی گلی میں۔“ عبدالرحمن کی آنکھیں سپاٹ تھیں...... بالکل خالی... کسی بھی جذبے سے خالی وہ نظریں جو اُسے اپنائیت سے تکتی تھیں آج اجنبی تھیں۔

”سوری شہزادی میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔“ تو عبدالرحمن اسے یاد نہیں آتا تھا۔ بالکل بھی یاد نہیں آتا تھا بس دل میں ایک گھاؤ تھا۔ اپنی بے وقتی کا، کم مائیگی کا اور اپنے ٹھکرائے جانے کا۔ بہت گہرا گھاؤ جو بھرتا نہیں تھا، رِستا رہتا تھا۔

”نہیں اماں، مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا۔“ اس نے پھر دُہرایا تھا۔ ”بس ایک خواہش ہے جو تنگ کرتی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر کی خواہش...... جہاں صبح، صبح میں اٹھ کر جھاڑو دوں، ناشتا بناؤں اور......“

مشتری کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا تھا۔ اس نے شہزادی کو گلے سے لگالیا تھا اور ہولے، ہولے تھپکنے لگی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں اماں سب ٹھیک ہے۔“ اس نے الگ ہوتے ہوئے مشتری کو تسلی دی تھی۔ ”رات کو کیا ملک صاحب آئیں گے؟ استانی جی نے مومن کی بڑی اچھی غزلیں یاد کروائی ہیں۔“

”ملک صاحب تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“ مشتری نے بتایا تھا اور وہ اٹھ کر اوپر کمرے میں آگئی تھی لیکن مشتری تو وہاں کی وہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا وہ پریشان نہ ہو لیکن اس کے دل کو تو جیسے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ شہزادی کے دل کی خواہش...... کچھ دیر بعد وہ اٹھی تھی اور برقع اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی۔ اس نے چاندنی یا خانو کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا اور انیس سال بعد وہ شیرو کو چوان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اپنے تانگے میں نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی دیکھتی رہی پھر آہستہ سے آواز دی۔

”شیرو۔“ وہ یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے نقاب چہرے سے ہٹایا۔

”مشتری!“ اس روز کے بعد اس نے تانگا گلی کے باہر کھڑا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس طرف سے گزرتا بھی نہیں تھا۔

”پہچان لیا تم نے؟“ مشتری کی آواز آہستہ تھی۔ شیرو نے سر ہلایا تھا۔

”مجھے تم سے بات کرنا تھی شیرو۔“

”خیر تو ہے ناں مشتری؟“ مشتری نے سر ہلا دیا تھا۔

”خیر ہی ہے۔“ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ ایک دو تانگے آس پاس کھڑے تھے۔

”جناح باغ چل وہاں ہی چل کر بات کرتے ہیں۔“ مشتری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ شیرو نے گھوڑے کو چابک مارا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں آواز لگائی تھی۔

”چل میرے شیر......شاباش۔“ اور مشتری جیسے بیس سال پیچھے پہنچ گئی تھی جب ایسے ہی کبھی کبھی وہ شیرو کے تانگے میں بیٹھ کر جناح باغ جایا کرتی تھی اور پھر......وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب شیرو نے تانگا ایک طرف کھڑا کیا تو وہ چونکی۔ سامنے ہی جناح باغ تھا۔

”زیادہ لمبی بات نہیں تو یہاں ہی بات کرلیں؟“ وہ پتا نہیں کیوں جھجک گیا تھا۔ مشتری نے آہستگی سے کہا۔

”ہاں، لمبی بات تو نہیں ہے۔“ شیرو نے گردن پیچھے کرلی تھی۔ تیز کڑکتی دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔

”شیرو تمہیں یاد ہے ہم نے شادی کی تھی اور دس دن ایک گھر میں رہے تھے۔“

”ہاں۔“ شیرو کی آنکھیں لمحے بھر کو چمکی تھیں۔ ”بوڑھا ہو رہا ہوں لیکن وہ دس دن دل کی تختی پر ایسے لکھے ہیں جو کسی پانی سے نہیں دُھلتے۔“

”ان دس دنوں کی یادگار ایک لڑکی ہے شیرو......تمہاری اور میری لڑکی...... اٹھارہ سال کی ہے۔ میں نے اسے قرآن پاک پڑھایا اور بارہ جماعتیں بھی پڑھ رکھی ہیں اس نے۔“

”ارے واہ۔“ شیرو خوش ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ”تم نے کبھی بتایا نہیں۔“

”کیا بتاتی......اب بھی نہ بتاتی شیرو اگر جو تیری لڑکی گھر بسا کر عزت سے رہنے کی خواہش نہ کرتی۔ شریف خون اس کے اندر لہریں مارتا ہے اور گھر بسا کر رہنا چاہتی ہے۔ شریف عورتوں کی طرح۔“ شیرو خاموشی سے سن رہا تھا۔

”تو میں تیرے پاس اس لیے آئی ہوں کہ تو کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کروادے۔“

”لیکن میں کہاں...... کیسے مشتری؟“ اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو باپ ہے اس کا، وہ عزت کی زندگی مانگتی ہے تو دے اسے عزت کی زندگی۔ گھر لے جا، کہہ دے تیری بیٹی ہے۔“

”گھر......تو جانتی ہے نہیں لے جاسکتا۔ میری بیوی بیٹے سب نکال دیں گے اس گھر سے۔“

”میں تیری بیوی تھی، میرا تیرا صرف کاغذوں کا رشتہ تھا، تو نے کھڑے کھڑے طلاق دے دی پر وہ تو تیرا خون ہے شیرے......“

”مجھے تیری بات کا یقین ہے مشتری پر میرے گھر والے یقین نہیں کریں گے اور......“

”اچھا چل مجھے واپس لے چل۔“ مشتری نے نقاب چہرے پر کرلیا۔

”اس کی قسمت میں بھی چوبارے میں ہی جینا مرنا لکھا ہے۔“ نقاب کے اندر اس کی آنکھیں بہتی تھیں اور وہ ہاتھ اندر کرکے آنکھیں پونچھتی تھی۔ آگے پیچھے سڑک خالی تھی بس گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی اور مشتری اب کچھ نہ سوچتی تھی۔

”مشتری مجھے معاف کردینا۔“ وہ تانگے سے اتری تو شیرو نے کہا۔ مشتری نے بنا کچھ کہے چھوٹا سا بٹوا کھول کر کچھ نوٹ نکالے۔

”یہ تیرا کرایہ ہے کم ہے تو بتادے۔“ شیرو نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو اس نے سیٹ پر پیسے رکھ دیے۔

”میں کوشش کروں گا کہ......“ لیکن مشتری آگے بڑھ گئی تھی۔ اگر وہ اسے اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا تو پھر کوشش بھی بیکار تھی۔ بے نام و نشان کا ہاتھ کس نے تھامنا تھا۔ اس نے کوشش کرلی تھی اب شہزادی کا نصیب تھا اور اس کے نصیب پر مشتری کا دل روتا تھا لیکن بظاہر کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ دو چار دن سے چوبارہ ویران پڑا تھا۔ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کالج یونیورسٹی کے لڑکے بھی نہیں جو اکا دکا آجاتے تھے۔ سورانی کل کے کپڑوں میں سستی سے پڑی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے آنکھیں بند مسلسل پیر ہلا رہی تھی۔

''رانی کیا تیرا دل نہیں چاہتا تیرا ایک گھر ہو۔ جہاں تو راج کرے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔'' شہزادی کے خواب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔

''نہیں، میرا ایسا کوئی دل نہیں چاہتا۔'' رانی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ''میرا دل تو چاہتا ہے کہ چاروں طرف میرے رقص کی دھوم ہو۔ میں کتھک میں اتنی مہارت حاصل کرلوں کہ ہندوستان، پاکستان دونوں جگہ بس میرا ہی نام ہو۔ رانی کا رقص اور شہزادی کا گانا دونوں کی دھوم مچ جائے پوری دنیا میں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے کچے گھروں میں بیٹھ کر اُپلے تھوپنے کا۔'' اس نے پھر آنکھیں بند کرلی تھیں اور گنگنانے لگی تھی۔

''مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے
ناچے رے ، ناچے رے''

''اور میں......'' شہزادی نے سوچا۔ ''مجھے جو اگر ایک کچے کوٹھے کا ہی سائبان مل جائے تو میں خوش ہوکر اُپلے تھاپوں اور گیلی لکڑیاں جلاتے ہوئے بھلے میری آنکھوں کا سارا پانی ختم ہوجائے اور تندور میں روٹیاں لگاتے روز میرے ہاتھ بازو جلیں تب بھی میں شکر کے سجدے کرتے کرتے نہ تھکوں۔'' اس نے رانی کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے یوں ہی پاؤں ہلائے جاتی تھی اور گنگناتی رہی تھی۔

''مدھوبن میں......''

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ وہ گلی میں داخل ہورہا تھا۔ آج اس نے نسبتاً صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بال بھی بنائے ہوئے تھے۔ آج چلتے ہوئے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ ابھی رات پوری طرح نہیں جاگی تھی۔ پتا نہیں شہزادی کے دل میں کیا آیا کہ وہ تیز، تیز چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتی ڈیوڑھی میں آگئی۔ ڈیوڑھی میں بے حد مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ گلی والا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ گلی میں تھوڑی رونق تھی۔ موتیے اور گلاب کی ملی جلی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چکر کاٹ کر پچھلی گلی میں آگئی وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''اے......تم یہاں کیا کرتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ''بس ایسے ہی آتا ہوں، اچھا لگتا ہے۔''

''کیا اچھا لگتا ہے؟'' شہزادی نے دلچسپی سے اسے دیکھا تو اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

''چلو گے میرے ساتھ؟'' اس نے جیب تھپتھپائی چند سکوں کی کھنکھناہٹ آئی۔

''نہیں۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔''

''ماں باپ کا کھاتے ہو؟''

''ماں باپ نہیں ہیں۔'' اب کے اس نے شہزادی کو غور سے دیکھا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔

''اکیلے رہتے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔

''گھر ہے؟'' شہزادی اسے کھوج رہی تھی۔

''ہاں ہے پر بڑی تنہائی ہے، اکیلا پن ہے وہاں اس لیے ادھر آجاتا ہوں۔ یہاں اندر سے آنے والی آوازیں سنتا ہوں تو تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔''

''کام کاج کچھ نہیں کرتے تو پھر کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟''

''کبھی کبھی مزدوری کرلیتا ہوں گزارہ ہوجاتا ہے۔''

''شادی کیوں نہیں کرلیتے؟''

''مجھ سے کون شادی کرے گا؟''

''میں......مجھ سے شادی کروگے؟''

وہ ہکا بکا سا ہوکر اسے دیکھنے لگا تو وہ واپس مڑی۔

''کل پھر آؤں گی پوچھنے تم سوچ لینا۔'' وہ اسے حیران چھوڑ کر واپس آگئی تھی۔ اب رانی بستر پر بیٹھی تھی۔ وہ اندر آکر بیٹھ گئی۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''نیچے گلی میں۔''

''خانو آگیا؟ چرغہ لینے بھیجا تھا؟'' رانی پوچھ رہی تھی۔

''ڈھیلے کی کمائی نہیں اور انہیں چرگا (چرغہ) کھانا ہے۔'' چاندنی بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

''آجاؤ نیچے لے آیا خانو چرغہ، نان۔''

''آؤ۔'' رانی کھڑی ہوئی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شہزادی اٹھ کر پھر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔ گلی خالی تھی۔ رانی نے جاتے، جاتے جھک کر کھڑکی میں سے دیکھا اور سوچا۔

''جانے شہزادی خالی دیواروں اور بند کھڑکیوں میں کیا دیکھتی ہے۔''

وہ کون تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کا نام کیا تھا اسے علم نہیں تھا پھر بھی وہ اسے اپنا خواب تھما آئی تھی اور اسے انتظار تھا کہ اس کے پاس اس خواب کی تعبیر تھی یا نہیں۔ ''ابھی اس سے ملاقات ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور انتظار شروع ہوا ہی نہیں تھا کہ وہ مایوس ہوگئی تھی۔ ایک بار چاندنی نے کہا تھا۔

''شریف آدمی رات کے اندھیرے میں ان گلیوں کے پھیرے تو لگا سکتا ہے لیکن کسی کو عزت سے تھام کر گھر لے جاتے کم ہی دیکھا ہے میں نے۔'' تو شاید آج کے بعد وہ نظر نہیں آئے گا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔ اسے انتظار نہیں تھا پھر بھی اگلی صبح سورج نکلنے کے بعد سے غروب ہونے تک کا وقت مشکل سے کٹا تھا۔ جب باہر اندھیرا چھا گیا تھا اور چوباروں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں تو اس نے بہت بے دلی سے کھڑکی کھول کر دیکھا تھا وہ سامنے ہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی اور پھر جیسے اڑتی ہوئی گلی میں پہنچی تھی۔ تیل لگائے ٹیڑھی مانگ نکالے سلیقے سے کنگھی کیے وہ کل سے قدرے بہتر کپڑوں میں تھا۔ وہ عبدالرحمن جیسا نہیں تھا۔ اس میں کچھ بھی عبدالرحمن جیسا نہیں تھا۔ نہ شکل

میرا ڈرائیور!

میرا ڈرائیور ڈرائیونگ کے علاوہ سب کچھ جانتا ہے، اس کا خیال ہے کہ سیاست، سفارت، مذہب، معیشت اور صحافت وغیرہ کے بارے میں اس کا علم ان شعبوں کے ماہرین سے زیادہ ہے، وہ ان موضوعات پر اظہارِ خیال اکثر ڈرائیونگ کے دوران کرتا ہے، میں اسے ٹوکتا ہوں کہ وہ اپنا دھیان صرف ڈرائیونگ کی طرف رکھے لیکن اسے میرا ٹوکنا ہر بار سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ایک دفعہ وہ مجھے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ ملک سیاست دانوں نے تباہ کیا ہے، دورانِ گفتگو وہ گردن پچھلی سیٹ کی طرف موڑ کر میرے تاثرات کا جائزہ بھی لیتا جاتا تھا جس کے نتیجے میں گاڑی سڑک کے ساتھ واقع ایک کھڈ میں جاگری اور یوں گاڑی کا انجر پنجر ہل گیا چنانچہ میں اس بات کا تو قائل نہ ہوسکا کہ سیاست دانوں نے ملک تباہ کیا لیکن یہ بات بالکل یقینی تھی کہ اس ڈرائیور نے گاڑی کو ضرور تباہ کردیا ہے۔

اقتباس: ہنسنا رونا منع ہے
از: عطاالحق قاسمی
پسند: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

صورت نہ قد بت۔ نہ بات کرنے کا وہ قرینہ پھر بھی وہ اسے عبدالرحمٰن سے اچھا لگا تھا کیونکہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ اس کے ساتھ مل کر باعزت زندگی گزار سکتی تھی۔ بھلے محنت مزدوری کرکے ہی کیوں نہیں۔ وہ اسے بہت بلند لگا بہت اونچائی پر بیٹھا اور عبدالرحمٰن ...... وہ تو بہت نیچے کہیں اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے مشتری کے پاس لے آئی۔

''اماں یہ...... یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' مشتری نے ایک نظر میں ہی اس کے حال حلیے سے اس کا سارا احوال جان لیا تھا پھر بھی آنکھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''کیا نام ہے، کیا کرتے ہو؟'' وہ گھبرایا، گھبرایا سا انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

''نام......''

''ہاں، کیا نام ہے تمہارا بتاؤ ناں؟'' شہزادی نے اسے حوصلہ دیا۔

''میرا نام حفیظ ہے۔'' شہزادی سے حوصلہ پاکر اس نے بتایا۔ ''مزدوری کرتا ہوں ادھر بسوں کے اڈے پر۔''

''گھربار؟''

''گھر اپنا ہے پر چھوٹا سا ہے تین مرلے کا شاہدرہ میں۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں اکیلا ہوں۔''

''شہزادی سے کہاں ملے ہو، کب سے مل رہے ہو؟''

''کل رات یہاں اس گلی میں پچھلی طرف ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی بار اور انہوں نے کہا تھا کہ کیا مجھ سے شادی کرو گے اور میں آگیا بتانے کے دل و جان سے۔'' مشتری نے ٹھنڈی سانس لے کر تاسف سے اسے دیکھا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو شہزادی نے حسرت سے اسے دیکھا۔ وہ چلا گیا تو شاید پھر نہ آئے۔

''یہ لڑکا تمہارے قابل نہیں ہے شہزادی۔'' مشتری نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کم عمر تھی ناتجربہ کار تھی اور مشتری تجربے کی بھٹی میں جل کر کندن بن چکی تھی۔

''اور جو لڑکے میرے قابل ہیں میں ان کے قابل نہیں ہوں اماں۔'' دکھ، اذیت، خودترسی کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ مشتری تڑپ گئی لیکن وہ اسے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتی تھی۔

''ایسے راہ چلتے لوگ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے شہزادی۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے ہمیں کوئی محل دو محلوں والا بیاہنے آئے گا؟''

''آ بھی سکتا ہے شہزادی، ملک صاحب کہہ رہے تھے ایک بار تو ٹی وی پر پرفارمنس دے، دے تیری آواز تہلکہ مچا دے گی پھر خود ہی آئیں گے بادشاہ اور شہزادے تیری دہلیز پر۔''

''اماں یہ شہزادوں ، بادشاہوں کا دور نہیں ہے۔ جو مل رہا ہے اسے ہی غنیمت جانو۔'' وہ عجیب طرح سے ہنسی۔ ایسی ہنسی کہ مشتری کو اپنے دل میں ہزاروں کانچ چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''شہزادی تو بوڑھی نہیں ہوگئی ہے۔ تجھے گھر بسانا ہے ناں...... ٹھیک ہے تو گھر بسالینا لیکن ابھی دو تین سال انتظار کرسکتی ہے۔ کیا پتا اس سے اچھا کوئی......'' مشتری کے اندر کہیں شیرو کا انتظار بھی چھپا ہوا تھا کیا پتا بیٹی کی محبت میں کوئی اچھا رشتہ دیکھ لے وہ۔

''میں انتظار کرتی رہوں اماں کسی اچھے کا اور یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔'' ایک گھر بسانے کی عزت سے رہنے کی خواہش اس کے اندر کرلاتی تھی اور مشتری کو تکلیف دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی ایسی خواہش اگر ایک بار دل میں بیدار ہوجائے تو اسے دل سے نوچ کر پھینکنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے

بالا بالا ہی وہ حفیظ کے ساتھ جا کر اس کا گھر بھی دیکھ آئی۔ ایک کمرا، دیوار کی اینٹوں میں سے سیمنٹ اکھڑا ہوا۔ صحن اور صحن کے ایک کونے میں غسل خانہ۔ باورچی خانے کا نام نشان نہ تھا۔ برآمدے میں دیوار کے ساتھ ایک مٹی کے تیل کا چولھا پڑا تھا۔

''اس گھر میں شہزادی رہے گی ؟'' اس نے چاندنی سے کہا تھا۔

''رہ لوں گی اماں۔'' شہزادی کو اعتراض نہیں تھا۔ اس گلی کی سب سے بڑی حویلی اور اس گھر میں سے مجھے ایک کو چننا ہو تو میں اسی گھر کو چنوں گی اماں۔'' وہ کم عمر تھی لیکن اس نے دوٹوک بات کی تھی پھر بھی مشتری سوچ میں پڑی تھی۔

''ملک صاحب آجائیں تو ان سے کہوں گی ان کا کوئی جاننے والا لاوارث اکیلا لڑکا جسے کوئی اعتراض نہ ہو...... پر کماتا تو ہو اچھا حفیظ کی طرح نہ ہو۔'' لیکن ملک صاحب پتا نہیں کب آتے اور رانی نے مشتری سے کہا۔

''اماں شہزادی فیصلہ کرچکی ہے تو نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بھاگ جائے گی۔ ایسا ہی چاؤ چڑھا ہے اسے گرہستن عورت کہلانے کا اور مشتری نے ہتھیار ڈال دیے۔

''چلو بسالو گھر جیسا بھی بستا ہے۔'' لیکن مشتری نے آخری بار اسے ضرور سمجھایا تھا پر شہزادی سمجھتی نہ تھی اور یوں مشتری نے اسے نکاح پڑھوا کر حفیظ کے ساتھ رخصت کردیا۔ حفیظ اکیلا آیا تھا۔ ایک سرخ ستاروں والا سلک کا سستا سا جوڑا اور نقلی زیور کا موٹے نگینوں والا ایک سیٹ۔ شہزادی نے خوش ہوکر اس کا لایا ہوا جوڑا پہنا تھا اور مشتری نے تصور ہی تصور میں شیرو کی طرف منہ کرکے تھوکتے ہوئے نکاح نامے میں شیرو کی جگہ رامو کا نام باپ کے خانے میں لکھوا دیا تھا۔

خانو اور چاندنی رکشے میں اسے چھوڑنے آئے تھے اور ان کے جانے کے بعد حفیظ بھی کھانے پینے کا سامان لینے چلا گیا تھا۔ وہ سر جھکائے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ حفیظ کو گئے بہت دیر ہوگئی تھی۔ وہ خوف زدہ تو ہوئی تھی لیکن پلستر اکھڑی دیواروں والا یہ گھر اس کا تھا۔ چھوٹا تھا لیکن اس کا تھا۔ وہ یہاں عزت سے سر اٹھا کر جیے گی اور پھر...... پھر عبدالرحمٰن کو بتائے گی کہ...... اور یہ عبدالرحمٰن کہاں سے آگیا تھا۔ وہ حفیظ کو سوچنا چاہتی تھی جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا لیکن بار بار حفیظ کے تصور کو دھکیل کر عبدالرحمٰن آ کھڑا ہوتا تھا۔ میٹھی، میٹھی نظروں سے اسے تکتا ہوا پھر باہر کھٹکا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ حفیظ جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا گیا تھا پھر صحن میں سے حفیظ کے گنگنانے کی آواز کچھ لڑکھڑاتی ہوئی سی......

''تھا یقیں کہ آنے گی یہ راتاں کبھی ''

پھر دروازہ کھلا اور حفیظ اندر آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شہزادی کا دل دھڑ دھڑ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا دوپٹا چھوڑ دیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔'' اس نے شہزادی کے ہاتھ کو پکڑا اور شہزادی کو اس کے منہ سے بدبو کا بھبکا آیا تو بے اختیار اس نے اپنا چہرہ پیچھے کیا۔

''تم نے نشہ کیا ہے حفیظ؟''

''کیا آج بھی نشہ نہ کرتا...... آج تو میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے۔'' وہ اٹھا اور اس نے لکڑی کی چوکور میز پر جو لفافے لا کر رکھے تھے، وہ اٹھاتے شہزادی نے دیکھا۔ لفافے تیل میں چپڑے ہوئے تھے پھر ایک تام چینی کی روغن اکھڑی پلیٹ میں لفافے الٹ دیے۔ سیخ کباب اور شامی کبابوں کی خوشبو کمرے میں بکھر گئی۔ تیسرے لفافے سے اس نے تین نان نکالے۔

''لو پہلے کھالو۔'' شہزادی نے نفی میں سر ہلا دیا اس نے دوبار پوچھا اور خود بڑے، بڑے لقمے لینے لگا۔

''بڑی حسرت تھی مجھے تم جیسی کسی کو قریب سے

دیکھنے کی لیکن میری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار میں گلشن بائی کے کوٹھے پر ستارہ بیگم کا ناچ دیکھنے گیا تھا۔ دھکے مار کر نکال دیا انہوں نے اور تب سے میں ان گلیوں میں چکراتا پھرتا تھا۔ گھنگروؤں اور طبلے کی آواز سنتا تھا اور تصور کی آنکھ سے دیکھتا تھا لیکن آج سچ مچ حقیقت میں دیکھوں گا۔'' وہ زور سے ہنسا تھا۔

''چلو اٹھو ڈانس کرو، دکھاؤ آج ساری حسرتیں نکال دو میری۔'' اس نے شہزادی کا بازو پکڑا جو ٹکر ٹکر آنکھوں میں وحشت بھرے اسے دیکھتی تھی۔

''ایسے کیا دیکھتی ہو بھئی، سہاگ رات کے ضائع جانے کا غم نہ کھاؤ ابھی ساری رات پڑی ہے۔ پہلے میری جان تھوڑا دل خوش کر دو۔ ویسے تمہاری ماں ہے بہت ہوشیار، جانتی تھی پیسے کے نام پر پھوٹی کوڑی نہیں سو حق مہر میں یہ گھر ہی لکھوا لیا۔ چلو میری بلا سے۔ تمہارا ہو یا میرا ایک ہی بات ہے۔ ہاں اٹھو ناں اب۔''

''مجھے...... مجھے نہیں آتا رقص۔''

''جھوٹ بولتی ہے۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں...... میں نے صرف گانا سیکھا ہے۔''

''گانا بھی سنیں گے میری جان لیکن پہلے ذرا تیری رونمائی تو دوں۔ دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔'' وہ اٹھا اور سامنے دیوار میں بنی بغیر طاقوں کی الماری میں سے ایک شاپر اٹھایا اور اس میں سے سرخ ساٹن کے پٹے پر لگے گھنگرو نکالے اور تھوڑا سا اونچا کر کے آنکھوں کے سامنے لہرا کر ہنسا۔

''یہ ہے تیری رونمائی...... ہے ناں انوکھی۔ پیتل کی پانی گرم کرنے والی گاگر بیچ کر خریدے ہیں۔

چھن کے چھن تیرے گھنگرو بولیں

چھن کے چھن '' اس نے ہاتھ ہلائے۔

''چھن کے چھن تیرے گھنگرو

چھن چھن چھن۔'' اس کی آواز ٹوٹ، ٹوٹ جاتی تھی اور شہزادی پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی تھی اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر گھنگرو بجاتا تھا۔

''چھن ...... چھن چھن۔'' اور دائیں پاؤں کی ایڑی زمین پر مارتا تھا۔ شہزادی ساکت بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

''چل ٹانگیں نیچے لٹکا تیری رونمائی دوں تجھے۔''

''نہیں۔'' وہ پیچھے ہٹی تھی۔ ''نہیں آتا مجھے رقص کرنا۔'' اس نے ہاتھوں سے گھنگرو پیچھے کیے یوں جیسے گھنگرو نہ ہوں سانپ ہوں۔

حفیظ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ خود زمین پر بیٹھ کر اسے گھنگرو باندھنے کی کوشش کرتا رہا۔

''میں نے تجھ سے شادی کیوں کی ہے۔ جانتی ہے اس لیے کہ تیرا رقص دیکھوں۔ میں کبھی کسی چوبارے میں نہیں جا سکا لیکن اب تیرا رقص دیکھوں گا...... ہاہا...... جانتا ہوں کتنی پارسا ہوتی ہو تم۔'' پہلے اس نے منتیں کیں پھر گالیاں دیں اور پھر ہاتھ اٹھا لیا۔ تھپڑ، مکے، لاتیں وہ خاموش پٹتی رہی۔ مارتے، مارتے وہ تھک گیا تو خود ہی بکتا جھکتا نشے میں نڈھال ہو کر وہاں ہی زمین پر گر گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اِدھر اُدھر گھنگرو اور سرخ دھجیاں بکھری تھیں۔ وہ غصے سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ وہی سرخ دوپٹا سر سے گردن تک اوڑھے سوئی ہوئی تھی یوں کہ سرخ ساٹن کی ایک دھجی اس نے اپنے ہاتھ میں بھینچ رکھی تھی اور اس کا چہرہ اتنا پیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس پر پیلا رنگ مل دیا ہو۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے حصے سے دھوپ چھن، چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور چہرہ چمک رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ جیسے زیادہ روشن ہوتا جا رہا تھا۔ حفیظ نے ڈرتے، ڈرتے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ موت کی خنکی اس کے ہاتھوں میں اتر گئی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا اور پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اس کے روشن چہرے کو دیکھنے لگا۔